سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

[redacted]

[redacted]



ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر خرم مراد

جلد ۱۲۲ | اگست ۱۹۹۶ء، ربیع الثانی ۱۴۱۷ | عدد ۸

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۰۱۲۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے

زر سالانہ -/۱۵۰ روپے

مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط -/۳۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

2

۶۰ سال پہلے

ترجمان القرآن کی اشاعت اس وقت صرف چھ سو ہے۔ دوسری قوموں کے علمی ذوق اور جرائد کی اشاعت کو دیکھتے ہوئے تو یہ تعداد بہت کم ہے مگر مسلمانوں کی ذہنی حالت کے لحاظ سے اس کو بہت زیادہ سمجھنا چاہیے کیونکہ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ دوسرا ہے۔ اس چھ سو کی تعداد میں سے پورے نصف کی خریدار سرکار آصفیہ ہے۔ اگر ان تین سو پرچوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی اس آبادی میں صرف تین سو اصحاب ایسے ہیں جو "ترجمان القرآن" کی وضع کا ایک رسالہ پڑھنے کے لیے کچھ خرچ کر سکتے ہیں۔ پھر ان تین سو میں سے بھی دس فیصد حضرات اپنے بجٹ میں اس رسالہ کی پوری قیمت کے لیے گنجائش نہیں نکال سکتے مگر چونکہ ہم خود ان تک اپنی آواز پہنچانے کے غرض مند ہیں اس لیے ہم کو مجبوراً رعایتی قیمت بلکہ بسااوقات برائے نام قیمت پر ان کے نام پرچہ جاری کرنا پڑا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس معیار کا کوئی پرچہ اتنی کم اشاعت پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی آمدنی میں اتنی گنجائش کہاں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے علمی رسالہ کی وہ ضروریات فراہم کر سکے جو طباعت کے مصارف سے بالاتر ہیں۔ نہ اس میں کتابیں خریدی جا سکتی ہیں جو علمی تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں۔ نہ اس میں علمی رسالے خریدے جا سکتے ہیں جو نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ نہ اس میں بلند پایہ مضامین لکھنے والوں کو ان کے وقت اور ان کی محنت کا کم سے کم معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ نہ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ کسی ایک لائق آدمی کی بھی خدمات مستقل طور پر حاصل کی جا سکیں تاکہ وہ ادارت کے کاموں میں ایڈیٹر کا ہاتھ بٹا سکے۔ ایسی حالت میں پرچے کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اس کا معیار بھی قائم رکھنے کا تمام تر بار ایک تنہا شخص پر ہے۔ وہ اس دوگونہ مشکل میں مبتلا ہو گیا ہے کہ ایک طرف تو اپنا تمام وقت اور اپنی پوری دماغی قوت اس پرچے کی ترتیب میں صرف کر دے اور دوسری طرف نہ صرف اپنی ذاتی ضروریات ' بلکہ خود پرچے کی ضروریات کا بھی ایک معتدبہ حصہ کہیں اور سے فراہم کرے جس کے لیے نہ اس کے پاس کافی وقت بچتا ہے اور نہ اس کے دل و دماغ میں اتنی طاقت باقی رہتی ہے کہ کوئی دوسرا کام کر سکے۔

اس حالت پر شکایت کا کوئی محل نہیں درحقیقت مجھ پر ان لوگوں کا احسان ہے جو اس رسالہ کو پڑھ لیتے ہیں' اور اس سے زیادہ احسان ان کا ہے جو اسے پڑھنے کے ساتھ اس کی پوری یا ادھوری قیمت بھی ادا کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد کسی مزید احسان کی درخواست نہ میں کر سکتا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ رہی پرچے کی زندگی' تو جو حضرات اس کے خریدار ہیں ان کو میں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ پرچہ ان شاء اللہ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک میں زندہ ہوں۔ میں بے مقصد زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا' اس لیے توفیق الٰہی سے جس قدر کوشش خود اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کرتا ہوں اسی قدر کوشش اپنے مقصد وجود کو بھی برقرار رکھنے کے لیے کروں گا۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی "اشارات' جلد ۸ عدد ۶' جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ' اگست ۱۹۳۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان --- پچاسویں یوم آزادی کے موقع پر

پروفیسر خورشید احمد

اس مہینے پاکستان اپنی زندگی کے پچاسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔

پاکستان کا قیام ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ سے پہلے دنیا کے سیاسی نقشے پر اس نام کا کوئی ملک موجود نہ تھا، جیسے مصر، شام، انڈونیشیا وغیرہ۔ بلاشبہ برعظیم میں مسلمان پہلی صدی ہجری سے موجود تھے اور انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں تقریباً نو سو سال تک ان کی حکومت رہی، لیکن برطانوی استعمار کے غلبہ کے بعد اس علاقے کی سیاسی اور نظریاتی حیثیت بدل گئی۔ پاکستان کے لیے تحریک اٹھی تو وہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کے نمونے سے ہٹ کر محض وطن کی آزادی کے لیے نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے ملک کو وجود میں لانے کے لیے تھی جو برصغیر کے مسلمانوں کا نظریاتی اور تہذیبی مرکز بن سکے۔ اصل ہدف ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام تھا جہاں مسلمان اپنے عقائد و نظریات، قانون و اقدار، تہذیب و ثقافت اور اپنی روایات و تاریخ کی روشنی میں ایک نیا معاشرہ اور نئی ریاست تعمیر کر سکیں۔ اس تحریک نے مغرب کے غالب سیاسی تصورات یعنی سیکولرزم، لبرلزم اور علاقائی قومیت کو چیلنج کیا اور دین و دنیا کی وحدت اور اسلام کے عالمگیر مشن کی بنیاد پر ایک ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کی۔ اس جدوجہد سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان کے قائم ہونے کی صورت میں پہلی اور بڑی روشن مثال وجود میں آئی۔ ایک مستشرق کے الفاظ میں: مسلمانان ہند کا پاکستان کے حق میں فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے فیصلے کے مماثل تھا۔

قائداعظمؒ نے پاکستان کے اس نظریے اور بنیاد کو بہت دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا تھا۔ اس بات کی مزید تشریح قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد مسلسل کی۔ ان کا ارشاد تھا:

"اسلام ہمارا بنیادی اصول اور حقیقی سہارا ہے۔ ہم ایک ہیں اور ہمیں ایک قوم کے طور پر آگے بڑھنا ہے۔ تب ہی ہم پاکستان کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں گے"۔

''پاکستان کا مطلب محض آزادی نہیں ہے بلکہ مسلم نظریہ حیات کا تحفظ ہے جو ہمیں ایک قیمتی تحفہ اور خزانے کے طور پر ملا ہے۔ اور جس میں ہمیں امید ہے کہ دوسرے بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے؟''

''مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں' جہاں وہ اپنے طریقہ حیات' اپنی ثقافت' روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں۔ ہمارا مذہب' ہماری ثقافت اور ہمارے اسلامی مقاصد حصول آزادی کے لیے ابھارنے والی اصل قوتیں ہیں''۔

(Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah, ed by M.A. Jamil. Lahore. pp 89,366,369,

اگر ہم بات علم سیاست کی زبان میں کہیں تو یہ دعویٰ بجا ہو گا کہ پاکستان کا قیام دراصل ایک معاہدہ عمرانی (social contract) کا نتیجہ ہے' جو تحریک پاکستان کی قیادت نے صرف پاکستان کا حصہ بننے والے علاقوں کے مسلمانوں ہی سے نہیں' بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں سے کیا تھا۔ اسی لیے' اس معاہدہ عمرانی کا پہلا اور سب سے بنیادی دستوری مظہر قرارداد مقاصد کی صورت میں نمودار ہوا' جس کو دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ کو منظور کیا' اور جسے بجا طور پر دستور کی اساس' قومی چارٹر اور اعلیٰ ترین قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا ظہور ایک ایسا تاریخ ساز واقعہ ہے جس کے بڑے دوررس اثرات نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام پر بھی مرتب ہوئے۔ ہم آگے بڑھنے سے پہلے اس کے چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ ضروری سمجھتے ہیں۔

قیام پاکستان کا پہلا اور سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے دور حاضر میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی خودی کو پہچانا اور اس طرح اپنے حقیقی وجود کو پایا۔ اس نے اہل پاکستان کو ان کا اصل تشخص دیا تھا۔ کانگریس اور سامراجی قوتیں جو خطرناک کھیل کھیل رہی تھیں' وہ ناکام ہوئیں اور مسلمانوں نے اپنے اصل تشخص کی بقا اور استحکام کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ انھوں نے بھی جن کو اس جدوجہد کے نتیجہ میں سیاسی آزادی ملی اور انھوں نے بھی جو جانتے تھے کہ سامراج کے رخصت ہونے کے بعد وہ خود حقیقی آزادی کی روشن صبح سے محروم رہیں گے۔ ان کو یہ یقین تھا کہ مسلمانوں کی ایک ایسی آزاد مملکت قائم ہو گی جو اسلام کا مظہر اور سارے مظلوم انسانوں کا سہارا ہو گی۔ نظریاتی وطن کے قیام کی اس کامیاب جدوجہد نے مغرب کی لادینی قومیت کے بت کو پاش پاش کر دیا اور ملت اسلامیہ پاک و ہند نے اقبال کا ہم زبان ہو کر انسانیت کے لیے ایک نئے روح پرور تشخص کی یافت سے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قیام پاکستان کا یہی وہ پہلو ہے' جس نے ۱۹۴۷ کے بعد پوری مسلم دنیا میں اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب و تمدن کے احیا کی ایک رو دوڑائی۔ مصر ہو یا شام' انڈونیشیا ہو یا ملائیشیا' ترکی ہو یا سوڈان' ایران ہو یا افغانستان　غرض' عالم اسلام کے جس گوشہ میں شریعت کے احیا کی تحریکیں موجود تھیں یا نمودار ہوئیں' پاکستان کی قرارداد مقاصد اور اسلامی احیا کی سعی و جہد کو بطور مشعل راہ کے پیش کیا گیا۔

قیام پاکستان کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس کے نتیجہ میں ایک طرف اہل پاکستان نے غلامی کی زنجیریں توڑیں' دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں کو امن کی جگہ میسر آئی۔ برعظیم کے مسلمانوں کے ایک بڑی تعداد "ترک وطن سنت محبوب الٰہیؐ" پر عمل کرتے ہوئے اپنے گھر بار چھوڑ کر اس نئے ملک کی تعمیر کے لیے سرگرم عمل ہو گئی۔ جس جذبے اور جن عزائم سے یہ ترک و اختیار' کے واقع ہوئے' وہ ہماری تاریخ کا نہایت ہی ایمان افروز اور روشن باب ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا' جس نے پاکستان کو ان اولیں ایام میں ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لائق بنایا' جو اس نوزائیدہ ملک کو درپیش تھے اور جن حوادث کا ہدف اس غنچہ کو پھول بننے سے پہلے ہی مسل دینا تھا۔ آزادی خود ایک بہت بڑی نعمت ہے' اور اس کا پورا ادراک انھی لوگوں کو ہو سکتا ہے' جنھوں نے غلامی کی تاریک رات کی صعوبتوں کو برداشت کیا ہے۔ آزادی کی شکل میں جو نعمت آج اہل پاکستان کو حاصل ہے وہ ہر دوسری نعمت سے زیادہ قیمتی اور حیات بخش ہے۔

اس تحریک کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ یہ ایک عوامی اور جمہوری تحریک تھی۔ قائداعظمؒ نے مسلمان عوام کو بیدار اور منظم کیا اور سب کچھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے عوامی قوت اور تائید کے ذریعہ سات سال کی قلیل مدت میں وہ کام کر دکھایا جو دوسرے' قرنوں میں بھی انجام نہ دے سکے۔ تحریک پاکستان ایک عوامی تحریک تھی۔ جن کی نظر تحریک پاکستان کی تاریخ پر ہے' وہ جانتے ہیں کہ سیاسی اشراف (elites) نے کس کس طرح اس تحریک کا راستہ روکا اور سازشوں کے جال بنے۔ لیکن اللہ کے فضل سے قائداعظمؒ کی قیادت اور عوام کی تائید و اعانت نے اس تحریک کو آزادی کی منزل سے ہمکنار کیا۔

اس تحریک کا چوتھا پہلو یہ تھا کہ قیام پاکستان اس تحریک کی آخری منزل نہیں تھا بلکہ پہلا سنگ میل تھا۔ اصل ہدف ایک ایسے معاشرہ اور ریاست کا قیام تھا' جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا سچا وفادار اور ان تعلیمات کا آئینہ دار ہو' جو انھوں نے انسانیت کو عطا کی ہیں۔ جس میں اخلاقی اقدار کو بالادستی

حاصل ہو' جہاں فرد کے حقوق کی پوری حفاظت ہو' جہاں ہر مرد اور ہر عورت کی جان' مال اور آبرو محفوظ ہو' جہاں تعلیم کی روشنی سے ہر فرد نور حاصل کر سکے۔ جہاں قانون کی حکمرانی ہو۔ جہاں رزق حلال اور معاشی ترقی کے مواقع تمام انسانوں کو حاصل ہوں' جہاں عدل اجتماعی کا بول بالا ہو اور جہاں ریاست اور اس کے کارپرداز عوام کے خادم ہوں۔ اسلام اور اس کے دیئے ہوئے جمہوری اور عادلانہ نظام کا یہ تصور تھا' جس نے مسلمانوں کو اس تحریک میں پروانہ وار شریک کیا تھا اور وہ برملا کہتے تھے ہم کو ایک بار پھر اس دور کا احیا کرنا ہے جس کی مثال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدینؓ نے قائم کی تھی۔

آیئے' قیام پاکستان کے ان مقاصد اور عزائم کے پس منظر میں پچاسویں سال کے آغاز پر اس امر کا جائزہ لیں کہ پاکستانی قوم اور اس کی قیادتوں نے کہاں تک ان اہداف کی طرف پیش قدمی کی اور ملک عزیز کو کون سے مسائل' خطرات اور چیلنج درپیش ہیں۔ نیز ان حالات میں اصل منزل کی طرف پیش رفت کے لیے صحیح حکمت عملی اور لائحہ عمل کیا ہے۔

تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان کے معروضی تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قیام پاکستان کا اصل کریڈٹ اللہ تعالیٰ کے فضل خاص کے بعد اگر کسی کو جاتا ہے تو وہ قائداعظم کی فراست و قیادت اور مسلمان عوام کا جذبہ اور قربانی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ان کی بیماری اور وفات نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی' جس میں وہ کھوٹے سکے' جو ان کے گرد جمع تھے' اقتدار پر قبضہ جما کر ریاست کی مشینری کو بالکل دوسرے ہی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے میدان میں آگئے۔

پہلے وزیراعظم کو گولی کا نشانہ بنا کر قومی منظر سے ہٹا دیا گیا' دوسرے وزیراعظم کو برطرفی کی تلوار سے نکال باہر کیا گیا۔ جب کہ ان کے مخلص ساتھیوں کو سازشوں کے ذریعہ غیر موثر کر دیا گیا' اور چند ہی سال میں بساط سیاست ایسی بدلی کہ اصل نقشہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ طبقہ' جس نے مختلف صورتوں میں برطانوی اقتدار کی چاکری کی تھی' خواہ اس کا تعلق سول اور ملٹری انتظامیہ سے ہو یا سیاسی کوچہ گردوں کے قبیلے سے' اقتدار کے ہر میدان پر قابض ہو گیا۔ قانون اور ضابطے کا احترام ختم ہو گیا۔ منتخب دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا گیا۔ انتظامیہ اور پولیس کو سیاسی قیادت نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا' جو بالآخر انھی کے ہاتھوں اسیر ہو کر رہ گئی۔ فوج کو بھی سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ عدلیہ نے کچھ مزاحمت کی' لیکن اسے بھی لگام دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ ۹ سال بعد پہلا دستور بنا' جسے ۲ ہی سال کے بعد توڑ دیا گیا' اور دستور شکنی کی ایک ایسی ریت چل پڑی' جس کے مذموم اثرات سے آج بھی نجات ممکن نہیں۔ جس احساس تشخص نے قوم کو جوڑا تھا' اس پر ہر

طرف سے تیشہ چلایا گیا: لادینی نظریات' علاقائیت' لسانیت' برادری کا تعصب' قبائلیت غرض کون سا تیشہ ہے جو اس پر نہ چلایا گیا ہو۔ آزادی کے بعد ۲۳ سال تک بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب نہ کرائے گئے۔ جس کے نتیجے میں علاقائی تعصبات نے سیاست کو آلودہ کیا اور قومی سیاست کی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی۔ مغربی اور ہندو تہذیب کو رواج دینے کی دانستہ کوشش کی گئی۔ معاشی ترقی کا وہ راستہ اختیار کیا گیا جس نے ملک کو ایک طرف طبقاتی تصادم میں مبتلا کیا تو دوسری طرف مغرب کے سودی سامراج کے چنگل میں اس طرح گرفتار کرلیا کہ آج ملک ۲۸ بلین ڈالر کے بیرونی اور ۸۰۰ ارب روپے کے اندرونی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ملک کا ہر فرد ۱۵ ہزار روپے سے زیادہ کا مقروض ہے' اور پیدا ہونے والا ہر بچہ اپنے کندھے پر اس قرض کا بوجھ لے کر اس دنیا میں آرہا ہے۔

فوج کے انگریز سربراہ نے قائداعظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور کشمیر کے بڑے حصے پر بھارت اصلاً فوجی قوت کے ذریعے ایک غیر قانونی (illegitimate) وثیقہ الحاق کا سہارا لے کر قابض ہو گیا اور آج تک قابض ہے۔ کشمیر کے عوام بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف مسلسل سرگرم جہاد ہیں۔ لیکن پاکستان کی ہر قیادت ان کی موثر مدد کرنے میں ناکام رہی ہے اور مقبوضہ کشمیر میں ۸۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان مسلسل ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں اور مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔

پاکستانی قیادتوں کی مسلسل غلط کاریوں اور عاقبت ناشناس پالیسیوں کے نتیجے میں بھارت کو موقع ملا کہ کشمیر کے بعد مشرقی پاکستان کو بھی قوت کے ذریعے پاکستان سے الگ کر دے۔ اس طرح دسمبر ۱۹۷۱ میں پاکستان کو دولخت کر دیا گیا۔ ستم بالائے ستم کہ ہم آج تک "شکست رشتہ تسبیح" کے اصل ذمہ دار کا محاسبہ بھی نہیں کر سکے۔

آزادی کے ۴۹ برسوں میں ۲۴ برس تک وطن عزیز مارشل لائی گرفت میں رہا اور باقی ایام بھی حقیقی جمہوریت سے بالعموم محروم رہے۔ پاکستان کا اصل المیہ ہی یہ ہے کہ آج تک اقتدار حقیقی معنوں میں عوام کی طرف منتقل نہیں ہوا' اور زندگی کے ہر شعبہ پر ایک مخصوص گروہ مسلط ہے۔ آبادی کے پانچ فی صد سے بھی کم افراد قومی دولت کے بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ زمین کا ۹۰ فی صد صرف ۱۰ فی صد کے پاس ہے۔ ۱۰ ہزار بڑے خاندان ہیں جو زمین کے ۵۰ فی صد سے زیادہ کے مالک ہیں۔ اور ان کے مالکانہ حقوق مسلمانوں سے غداری کے صلے میں انگریز کا عطیہ ہیں۔ تقریباً دو ہزار خاندان ہیں جو ۱۹۵۰ سے اب تک سیاست پر چھائے رہے۔ اور جو بھی حکمران ہو' کوئی بھی پارٹی ہو یا فوج ہو' ہر زمانے میں اقتدار انھی گنے چنے افراد کو حاصل رہا ہے۔ نئی صنعت اور تجارت کا حال بھی مختلف نہیں۔ اس میدان میں بھی وہی چند ہزار خاندان دولت کی کنجیوں کے مالک ہیں۔ سیاست ہو یا معیشت' ہر میدان میں وراثت کا اصول جاری و ساری ہے اور محنت اور میرٹ کا ہر قدم پر خون کیا جا رہا ہے۔

اس ہمہ گیر بگاڑ کے تین بڑے ہی تشویش ناک پہلو ہیں ۔ پہلا اخلاقی بگاڑ جو خود سرکاری سرپرستی میں منظم اور ہمہ گیر کوششوں کے نتیجہ میں بد سے بدتر صورت اختیار کر رہا ہے اور ظلم اور بداخلاقی اس مقام کو چھو رہی ہے جہاں سے کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی رخصت ہوتا نظر آتا ہے ۔ کرپشن کا دور دورہ ہے جو تقریباً ہر سطح پر طریق حیات بنتی جا رہی ہے حتیٰ کہ بین الاقوامی ادارے بھی پاکستان کو دنیا کے دو یا تین سب سے زیادہ کرپٹ ملکوں میں شامل کر رہے ہیں ۔ ملکی اور عالمی ذرائع ابلاغ سب ہی اسلامی شعائر اور معاشرے کی مسلمہ اقدار و آداب کو پامال کرنے میں مصروف ہیں ۔ تعلیم کے نظام نے صرف علم ہی کی رسوائی کا سامان نہیں کیا ہے' اخلاق کا بھی جنازہ اٹھا دیا ہے ۔ روایات کے بند ٹوٹ رہے ہیں اور اباحت اور آزادروی کا سیلاب امنڈ رہا ہے ۔ اور بچشم سر دیکھا جا سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ۔

دوسرا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ افراد کے اس اخلاقی بگاڑ کے ساتھ ساتھ ملک و ملت کے ہر اس ادارہ کو تباہ کیا جا رہا ہے جو قوم کی کشتی کو لنگر کی طرح تھامتا ہے ۔ دستور ہو یا قانون' پارلیمنٹ ہو یا انتظامیہ' عدلیہ ہو یا پولیس' سول سروس ہو یا لوکل باڈیز' تعلیم ہو یا ذرائع ابلاغ حتیٰ کہ قوم کا آخری سہارا یعنی خاندان ہر ایک کو تباہ کیا جا رہا ہے ۔ جن اداروں کو بڑی محنت اور قربانی سے استعمار کے اقتدار کے باوجود محفوظ رکھا گیا تھا' آج ان کی چولیں ہل گئی ہیں اور دیواریں گر رہی ہیں ۔

بگاڑ کا تیسرا پہلو پالیسی سازی کے سارے عمل اور فیصلہ کرنے والے اداروں اور افراد کا بیرونی اثرات کے تابع ہونا ہے جس سے ملک کی سیاسی اور نظریاتی آزادی خطرے میں پڑ گئی ہے ۔ معاشی پالیسیاں بیرونی ساہوکاروں کے ہاتھوں گروی رکھ دی گئی ہیں اور اب ورلڈ بنک اور آئی ۔ ایم ۔ ایف کا دخل اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کا بجٹ ملک کی پارلیمنٹ نہیں' ان اداروں کے احکام کے مطابق بنایا جا رہا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خود وزیراعظم کے معاشی مشیر' تجار اور صنعت کاروں سے کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ کو اپنی سفارشات کو منظور کرانا ہے تو آئی ۔ ایم ۔ ایف کے کارپردازوں سے بات کریں! یہی حال قانون سازی کا ہے ۔ قانون بناتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جا رہا کہ ملک و ملت کا مفاد کیا ہے یا' اللہ اور اس کے رسولؐ کا فرمان کیا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ امریکہ اور مغرب کس بات پر خوش ہو گا اور کس پر نکتہ چینی ۔ چونکہ مغرب نے آج کل فنڈا منٹلزم اور تشدد کا ہوا کھڑا کر رکھا ہے اس لیے ہم نہ صرف قسمیں کھا رہے ہیں کہ ہم فنڈا منٹلسٹ نہیں ہیں بلکہ ہر قانون اور اخلاقی قدر کو پامال کر کے واشنگٹن اور اس کے گماشتوں کے آگے ناک رگڑ رہے ہیں اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ان بھیڑیوں اور درندوں کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں ۔ خود اقتدار میں آنے اور اقتدار میں رہنے کے لیے عوام اور پارلیمنٹ کی بجائے واشنگٹن کی آشیرباد حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی

ہیں۔

غرض سیاست، معیشت اور ثقافت و تمدن ہر میدان میں ہم اپنی آزادی اور حاکمیت پر سمجھوتے کر رہے ہیں اور جو کچھ مسلمانان پاک و ہند نے اپنی جان، مال اور آبرو کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا اسے چند طالع آزما اپنے مفاد کی خاطر مسلسل داؤ پر لگاتے چلے آ رہے ہیں اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔

یہ ہے وہ حالتِ زار جس میں آزادی کے ۴۹ سال کے بعد ماضی کے کچھ فوجی اور ماضی اور حال کی کچھ نام نہاد جمہوری قوتوں کی حکمرانی کے طفیل پاکستان اور اہل پاکستان مبتلا ہیں۔ وہ ملک جو پوری ملت اسلامیہ کے لیے نئی امیدوں اور ایک روشن مستقبل کا پیغام لے کر سیاسی افق پر رونما ہوا تھا اسے ان اتھاہ تاریکیوں میں پہنچا دیا گیا ہے اور بگاڑ اس انتہا کو پہنچ گیا ہے جہاں لوگ خود ملک کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے لگے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ

ایسا حبس کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ!

صورتِ حال کے بگاڑ اور تاریکی کی شدت کا انکار حقیقت کے انکار اور عاقبت نااندیشی کے مترادف ہو گا۔ لیکن ہماری نگاہ میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے بھی کہ مایوسی کفر ہے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ حالات کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں، مومن کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا (لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ) ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مخلص انسانوں کی قربانیوں کو کبھی رایگاں نہیں کرے گا جن کے خون اور عصمتوں کی قربانی سے یہ ملک عزیز وجود میں آیا ہے۔ اس لیے بھی کہ تاریخ کا یہی فیصلہ ہے کہ بگاڑ کی قوتیں ایک خاص حد پر پہنچنے کے بعد شکست و ریخت کا نشانہ بنتی ہیں اور خیر اور صلاح کی قوتیں بالآخر غالب ہوتی ہیں۔ جس طرح زوال اور انتشار ہماری تاریخ کی ایک حقیقت ہے اسی طرح تجدید اور احیا بھی ایک درخشاں حقیقت ہیں۔

گھبرائیں نہ ظلمت سے گزرنے والے آغوش میں ہر شب کے سحر ہوتی ہے

ذرا برعظیم ہی کی تاریخ کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال اور برطانیہ کے غلبہ کے بعد کیا حالت تھی۔ وقت کا نقیب بجا طور پر کہہ رہا تھا کہ

ظلمت کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

تاریکی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں نعوذ باللہ خدا کا جنازہ نکالا گیا اور الحاد اور سوشلزم کا کھلے بندوں پرچار ہوا۔ مسلمانوں کی شدھی کی گئی اور ان کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ لیکن پھر چشم تاریخ نے دیکھا کہ حالات بدلے اور ایک نئی تحریک ابھری

اور مسلمان آزادی سے ہمکنار ہوئے۔ کشمیر میں ہندوستان کی فوجوں کی قوت اور ظلم و غارت گری کو دیکھیے اور یہ بھی دیکھیے کہ کس طرح چند ہزار نوجوانوں نے ایمان اور عزم راسخ کے ذریعے سات لاکھ فوجیوں کے دانت کھٹے کر دیے ہیں۔ افغانستان میں روس کس زعم کے ساتھ آیا تھا۔ لیکن دیکھیے کہ دس سال کے اندر حالات نے کیسا پلٹا کھایا اور نہ صرف یہ کہ روسی افواج افغانستان سے پسپا ہوئیں بلکہ خود اشتراکیت صرف افغانستان ہی سے نہیں خود اپنے مستقر سے پسپا ہونے پر مجبور ہوئی' اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عالمی نظریے اور سوپر پاور کا شیرازہ بکھر گیا۔

خود پاکستان کے حالات پر اگر آپ غور کریں تو صاف نظر آئے گا کہ یہاں لادینی قوتوں نے ہر زمانہ میں طرح طرح سے اسلام کو نشانہ بنایا مگر بالآخر منہ کی کھانا پڑی۔ سیکولر طبقے کو مجبوراً دستور میں اسلام کی بالادستی کے اصول کو تسلیم کرنا پڑا۔ ایک نیم فوجی آمر نے بڑے طمطراق سے کہا تھا کہ سارے مولویوں کو کشتی میں بٹھا کر ملک سے رخصت کر دیا جائے گا لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ اہل ایمان تو مضبوط رہے لیکن اس آمر ہی کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔ ایک دوسرے فوجی آمر نے بڑے دعوے کے ساتھ فرد واحد کا بنایا ہوا دستور ملک پر مسلط کیا اور پاکستان کے نام سے ''اسلامی'' اور دستور سے ''قرارداد مقاصد'' کو نکالنے کا اعلان کیا لیکن دو سال کے اندر اندر خود اس کو پسپا ہونا پڑا۔ پاکستان کا اصل اسلامی نام بھی بحال ہوا اور قرارداد مقاصد بھی دستور کا حصہ بن گئی اور خود اس ہی کے ہاتھوں بنی۔ پھر ایک سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے باقاعدہ ''سوشلسٹ پاکستان'' کا نعرہ ہی نہیں لگایا بلکہ دستور کا مسودہ بھی اسمبلی میں پیش کر دیا جس میں پاکستان کو سوشلسٹ اسٹیٹ بنانے کا اہتمام کیا گیا تھا مگر چند ہی ماہ میں اسے اسلام کی کڑوی گولی نگلنا پڑی اور پاکستان اسلامی جمہوریت قرار دے دیا گیا اور دستور کی اسلامی دفعات اپنے اصل رنگ میں جلوہ افروز ہوئیں بلکہ ایک ایسی اسمبلی نے جس پر سیکولر عناصر کا غلبہ تھا' وہ دستوری ترمیم بھی متفقہ طور پر منظور کی جس نے ختم نبوت کے تمام باغیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کیا۔ اس طرح جدید تاریخ میں پہلی بار مسلمان کی تعریف دستور کا حصہ بنی۔

الحمدللہ فوجی یا سول آمریت کے ہر دور کا انجام بالآخر آمروں کی شکست اور عوام کی فتح کی صورت میں ہوا۔ نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر نشیب کے بعد فراز اور ہر پستی کے بعد بلندی کا ظہور ہوتا ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے   اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

عالمی پس منظر میں ایک اور مثال بھی قابل غور ہے۔ پاکستان نے جب عزم صمیم کے ساتھ اپنے دفاع کے لیے نیوکلیر ٹیکنالوجی کے حصول اور ترقی کا فیصلہ کیا تو آپ نے دیکھا کہ تمام عالمی دباؤ' ہر طرح کی مزاحمت اور پابندیوں کے باوجود اللہ کے فضل اور ہمارے سائنس دانوں کی محنت شاقہ کے

نتیجے میں خود اپنے وسائل سے کس طرح ملک نے صرف آٹھ نو سال میں وہ کچھ حاصل کر لیا جسے بڑے بڑے ترقی یافتہ اور طاقتور ملک بھی پندرہ بیس سال میں حاصل کر سکے تھے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ' یہ اللہ کا فضل ہے اور جسے چاہتا ہے وہ عطا کرتا ہے۔

جہاں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں وہاں یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ کوشش اور جدوجہد اور قربانی کے بغیر حالات تبدیل نہیں کرتا۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں سعی و جہد ہی پر نتائج کا انحصار ہے۔ بلاشبہ اللہ کی مدد اور نصرت اصل فیصلہ کن قوت ہے لیکن یہ بھی اللہ ہی کی سنت ہے کہ وہ اپنی نصرت سے انھی کو نوازتا ہے جو اس کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور جو ایمان اور احتساب کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ سعی انسان پر لازم ہے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

حالات کی اصلاح اور وقت کے دھارے کو موڑنے کے لیے جس لائحہ عمل کی ضرورت ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے آیئے ' نہایت اختصار کے ساتھ ان موٹے موٹے اسباب کو متعین کریں جو بگاڑ کا سبب ہیں۔

۱۔ بگاڑ کا پہلا بنیادی سبب اللہ تعالیٰ سے بے وفائی اور اس عہد کی وعدہ خلافی ہے جو تحریک پاکستان کے دوران خدا اور خلق سے کیا گیا تھا۔ بلاشبہ دستور کی حد تک عوامی دباؤ کے تحت اسلام کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا لیکن عملاً زندگی کے کسی بھی میدان میں شریعت کی بالادستی کو قائم نہیں کیا گیا اور نہ ہی ایسی لیڈر شپ کو بروئے کار آنے دیا گیا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفادار اور ان کے احکام کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ کی تشکیل جدید کرنے کا جذبہ اور صلاحیت رکھتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ اخلاص اور ایمان کی حامل قوتوں کی مدد فرماتا ہے یا اپنی مشیت کے مطابق کفر اور بغاوت کرنے والوں کو بھی کام کا موقع دیتا ہے لیکن نفاق اور دوغلے پن کے ذریعے کبھی کسی بازی کو سر نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ہم نے نام تو اسلام کا لیا لیکن عملاً اسلام سے انحراف کے ہر راستہ کو اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ کو تو ہم کیا دھوکہ دیتے ' بس اپنے ہی کو دھوکہ دیا اور قوم کو ایک کے بعد دوسری مصیبت میں گرفتار کیا۔

ہمارے لیے ترقی کا ایک ہی راستہ ہے کہ من حیث القوم ہم اللہ تعالیٰ سے اپنی اس روش پر توبہ کریں اور ایسی قیادت کو بروئے کار لانے کی سعی کریں جو اسلام کے بارے میں مخلص بھی ہو اور یہ صلاحیت بھی رکھتی ہو کہ کسی سمجھوتے کے بغیر حکمت کے ساتھ اسلام کے اصول و مقاصد کے مطابق زندگی کے تمام شعبوں کی تشکیل نو کر سکے۔

۲۔ دوسرا اہم مسئلہ 'جو بڑی حد تک بگاڑ کے پہلے سبب کی بنیاد ہے وہ قوم کا دو بڑے طبقوں میں بٹ جانا ہے۔ ان پچاس برسوں میں ایک ایسا مفاد پرست طبقہ وجود میں آگیا ہے جو لوکل باڈیز سے لے کر اقتدار کے اعلیٰ ترین اداروں تک چھایا ہوا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جسے سامراجی دور میں قیادت کے منصب پر لایا گیا تھا اور جو بیرونی استعمار کے آلہ کار کے طور پر اپنی ہی قوم کو غلام بنانے کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ بیشتر زمینداروں اور جاگیرداروں کا تعلق اسی طبقے سے ہے۔ پھر سول اور ملٹری بیورو کریسی کا بڑا حصہ بھی اسی طبقے سے متعلق ہے۔ نیا سرمایہ دار اور بورژوائی طبقہ جو معاشی ترقی اور بیرونی امداد کے سہارے ابھرا وہ بھی اسی طائفے میں شامل ہو گیا۔ مغربی اقوام نے بھی اسی طبقے کو ذریعہ بنایا' اسی کو مضبوط کیا اور اسی کی نئی نسلوں کو تعلیم' تربیت اور وسائل سے مالا مال کر کے قوم پر ایک ایسی قیادت کے نسل در نسل مسلط رکھنے کا اہتمام کیا جو ملت اسلامیہ کے مقاصد سے ناآشنا' اس کے مزاج سے ناواقف' اس کے اخلاق اور شعائر سے نابلد اور اپنے ذاتی مفاد اور مغربی اقوام کے اغراض و مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل ہے۔

یہ ہے وہ طبقہ جو عوام اور اقتدار کے درمیان حائل ہے اور اس کی وجہ سے آج تک اقتدار عوام کی طرف حقیقی معنی میں منتقل نہیں ہوا۔ یہ تعلیم کے فروغ کی راہ میں حائل ہے' اس نے معاشی لوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے' اس نے صحیح ترقیاتی ترجیحات پر کبھی عمل نہیں ہونے دیا' اس نے قومی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ اس کے سامنے صرف اپنا مفاد ہے۔ اور مفاد کی طمع نے اسے اتنا اندھا کر دیا ہے کہ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس طرح وہ اس ملک ہی کو تباہ کر رہا ہے جس کی بقا اور ترقی میں سب کے لیے حیات ہے اور جس کی تباہی سب کے لیے موت کا پیغام ہے۔

۳۔ خرابی کی تیسری بڑی وجہ دستور اور قانون کے احترام کی کمی ہے۔ جن کے ذمہ قانون کی بالادستی کا قیام ہے وہی اس کو سب سے زیادہ توڑنے کا باعث ہیں۔ بار بار دستور کے توڑنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دستور اور قانون کا احترام باقی نہیں رہا ہے۔ احتساب کا کوئی موثر نظام موجود نہیں ہے جو دستور اور قانون کے توڑنے والوں اور قومی خزانہ کو لوٹنے والوں کی موثر گرفت کر سکے۔ میرٹ کا اصول ختم ہو گیا ہے اور سفارش مشکل کشا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے سول حکومت کے پورے نظام کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ سول ایڈمنسٹریشن اور پولیس کا سیاسی مقصد کے لیے استعمال کھلم کھلا ہو رہا ہے۔

۴۔ بگاڑ کا چوتھا سبب اقتدار کا ارتکاز ہے۔ جمہوریت محض الیکشن کا نام نہیں۔ جمہوریت تو عبارت ہے قانون کی حکمرانی' تقسیم اور توازن اختیارات' اجتماعی محاسبہ' حقوق کے احترام' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مواقع کی موجودگی' عدلیہ کی آزادی اور صاف ستھری اور اہل حکومت

ہے۔ اور یہی چیزیں ہمارے یہاں مفقود ہیں۔ ارتکاز اقتدار ہی کا ایک پہلو مرکز میں اختیارات کا جمع ہو جانا اور دستور کے مطابق صوبوں اور لوکل باڈیز کو ان کے حقیقی اختیارات اور مواقع کار سے محروم رکھنا ہے۔ ملک اب اس مقام پر آگیا ہے جہاں اگر فوری اصلاح نہ ہوئی تو بہت بڑی تباہی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ مرکز گریز تحریکوں کے رونما ہونے کی ایک بڑی وجہ نیچے تک اختیارات اور وظائف کی تقسیم اور ترسیل کے بنیادی مسئلہ سے اغماض ہے۔

۵۔ بگاڑ کا پانچواں سبب تعلیم کی کمی اور تعلیم کے اسی نظام کو مزید بگاڑ کے ساتھ باقی رکھنا ہے جو سامراجی قوتوں نے ایک غلام قوم کے لیے بنایا تھا۔ مسئلہ تعلیم سے محرومی کا بھی ہے اور غلط تعلیم کا بھی۔ پھر ملک میں آج کوئی ایک تعلیمی نظام نہیں ہے۔ تین تین نظام بیک وقت چل رہے ہیں۔ ایک عام لوگوں کے لیے جس کی زبوں حالی دیدنی ہے۔ ایک دوسرا روایتی دینی تعلیم کا نظام جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور تیسرا وہ اشرافی (elitist) تعلیمی نظام جو صرف اہل ثروت اور مفاد پرست طبقہ کے بچوں کے لیے ہے اور جس کے ذریعہ یہ طبقہ اپنے اقتدار کو دوام بخشنے میں سرگرم ہے۔

۶۔ بگاڑ کا چھٹا سبب غلط معاشی نظام ہے جس نے ایک طرف زراعت کو قرار واقعی ترجیح نہیں دی اور دوسری طرف زراعت کی لئی بنیادی اصلاحات کا راستہ روکا جس کے بغیر ملک زمینداری اور جاگیرداری کی لعنت سے نجات نہیں پا سکتا۔ اس پر مستزاد وہ نیا صنعتی اور تجارتی نظام ہے جس نے جدید سرمایہ داری کو کھل کھیلنے کا پورا موقع دیا ہے اور جس کے نتیجے میں ملک میں ایک ایسی معیشت ترقی پا رہی ہے جس کی پیداواری صلاحیت محدود اور جس کا سارا بہاو تعیش کی زندگی، سرونٹ کا فروغ، درآمدات کے ذریعے دولت مند طبقے کے لیے فراوانی کی کیفیت پیدا کرنا ہے۔ بنیادی صنعتی اور سماجی انفراسٹرکچر (industrial and social infra structure) کی ضرورت سے اغماض برتا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں غربت بڑھ رہی ہے۔ آبادی کا ۳۰ سے ۴۰ فی صدی آج ضروریات زندگی سے محروم ہے اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اصلاح کا راستہ کیا ہے؟ ہماری نگاہ میں نہ فوج کی مداخلت حالات کو درست کر سکتی ہے اور نہ تشدد کی سیاست۔ ملکی سیاست میں تصادم اور تلخی جس حد کو پہنچ گئی ہے اس سے صرف سیاست ہی نہیں ملک کا وجود خطرے میں ہے۔ ہماری نگاہ میں اس کی بڑی وجہ حکومتوں کی آمرانہ روش، تنگ دلی اور تنگ نظری ہے۔ ویسے تو بگاڑ کی ذمہ داری تمام ہی حکومتوں پر درجہ بہ درجہ آتی ہے لیکن موجودہ حکومت سب پر بازی لے گئی ہے۔ اس نے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد تصادم کی

جو روش اختیار کی' اس کا آغاز صوبہ سرحد میں صوبائی حکومت کو غیر دستوری' اور غیراخلاقی طریقے سے تبدیل کرنا تھا۔ یہ وہ ٹیڑھی اینٹ تھی جس کے بعد سے حال یہ ہے کہ تاثریامی رود دیوار کج۔ اور اب تو عالم یہ ہے کہ کراچی سے راولپنڈی تک معصوم انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اور کسی کی آنکھ نہیں کھل رہی۔ یہی وہ حالات ہیں جو تشدد کی سیاست کو جنم دیتے ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک کے وہ تمام عناصر جو حالات سے غیر مطمئن ہیں' بگاڑ کے اسباب پر متفق ہیں اور جو اصلاح کے خواہاں ہیں وہ مل جل کر موثر سیاسی جدوجہد کے ذریعہ صرف برسراقتدار افراد ہی کو بدلنے کی سعی نہ کریں بلکہ نظام کو بھی بدلنے کی جدوجہد کریں۔ بگاڑ کے ایک ایک سبب کو دور کرنا ہوگا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک نئی قیادت ابھرے جس کا دامن پاک ہو' جو عوام میں سے ہو اور جو عوام کے سامنے جوابدہ ہو۔

سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کے اصل مقاصد' اس کی منزل اور ترجیحات کے بارے میں یکسوئی ہو۔ وہ تمام دینی اور سیاسی عناصر جو اسلام' جمہوریت' عدل اجتماعی اور خودانحصاری پر یقین رکھتے ہیں وہ ایک دوسرے سے قریب آئیں اور اصولوں پر پختہ ایمان رکھنے والی باکردار قیادت کو قوم کے سامنے لائیں۔

قائداعظمؒ نے اپنا مقدمہ جاگیرداروں' سرمایہ داروں اور روایتی سیاست کاروں کے سامنے نہیں' برعظیم کے مسلم عوام کی عدالت میں پیش کیا۔ ان کو بیدار اور متحد کیا اور ایک ایسی عوامی اور جمہوری لہر پیدا کی کہ روایتی قیادتیں اس سیلاب کے آگے بہہ گئیں۔ آج پھر اس کی ضرورت ہے کہ جمہوری ذرائع سے جمہور کو بیدار اور منظم کیا جائے اور پاکستان کے مقاصد کے لیے ان کو متحرک کیا جائے۔ ملکی اور غیرملکی سازشی عناصر کا اصل توڑ عوام کی بیداری اور ان کی منظم قوت ہے۔

دوسری بنیادی چیز قیادت کا صحیح معیار ہے۔ قوم نے بہت دھوکے کھائے ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نئی قیادت عوام میں سے ابھرے۔ اور اپنے اخلاق اور کردار کے اعتبار سے دستور پاکستان میں مرقوم معیار (دفعہ ۶۲۔ ۶۳) پر پوری اترے۔ عوام اور الیکشن کمشن کو یہ اختیار ملنا چاہیے جیسا کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں کہا ہے کہ وہ ان دفعات کو عملاً نافذ کر سکیں۔ یہ وہ چھلنی (filter) ہے جس سے بہتر قیادت رونما ہو سکتی ہے۔

تیسری چیز ایک ملی ضابطہ اخلاق کی تشکیل ہے جس کی پابندی تمام سیاسی جماعتوں' پریس اور میڈیا پر لازم ہو۔ اسے افہام و تفہیم سے مرتب کیا جانا چاہیے۔ کافی کام ماضی میں ہوا ہے۔ خود دستور میں اس سلسلہ میں بڑی رہنمائی موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر نیا اتفاق رائے پیدا کیا جائے اور اس کے نفاذ کے لیے کوئی موثر نظام بنایا جائے خواہ عدلیہ اس کام کو انجام دے یا کوئی اور نیا قومی

ادارہ۔

چوتھی چیز نظام انتخاب کی اصلاح ہے۔ انتخابی کمیشن حکومت اور اہم احزاب اختلاف کے باہم مشورے اور اتفاق رائے سے مقرر ہونا چاہیے۔ پاکستان کے حالات میں انتخابات نگران حکومت کے تحت ہونے چاہئیں جس کے بغیر منصفانہ انتخابات کی توقع عبث ہے۔ بنگلہ دیش کا حالیہ تجربہ اس سلسلہ میں قابل غور ہے۔ اس امر پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ اسمبلی کی مدت پانچ سال سے کم کر کے ۴ سال کر دی جائے تاکہ احتساب کم وقفے سے ہو سکے۔

پانچویں چیز ایک اعلیٰ احتسابی کمیشن کا قیام ہے جس کا مطالبہ جماعت اسلامی اول دن سے کر رہی ہے اور جس کا وعدہ خود پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی دونوں اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ دوسری جماعتوں نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ یہ مستقل کمیشن حکومت، احزاب اختلاف یا کسی بھی شہری یا متاثر ہونے والے فرد کی طرف سے تمام منتخب اور دوسرے ذمہ دار افراد کا احتساب کر سکے اور اس ادارہ کو یہ اختیار حاصل ہو کہ جس نے بھی اپنی سرکاری حیثیت کو ذاتی نفع کے لیے استعمال کیا ہو اسے قرار واقعی سزا دے اور عوامی وسائل ان سے واپس لے کر سرکاری خزانے میں لائے۔

چھٹی چیز دستور کے مطابق صوبائی اور لوکل باڈی کی سطح پر اختیارات کی منتقلی ہے۔ سینیٹ کو زیادہ مضبوط اور موثر بنانا بھی اس سلسلہ میں بڑا مفید ہو سکتا ہے۔

ساتویں چیز عدلیہ کی آزادی، اس کی انتظامیہ سے علیحدگی اور عدلیہ کے فیصلوں کی بلاامتیاز تنفیذ ہے۔

آٹھویں چیز سول انتظامیہ اور پولیس کا ایسا انتظام ہے جو ان کی آزاد اور غیر سیاسی حیثیت کو مستحکم کر سکے۔ ملکی، سول انتظامیہ اور پولیس، ریاست کا ادارہ تو ہوں مگر حکمران پارٹی کے سیاسی آلہ کار نہ ہوں۔ اس کے لیے دستوری دیا جائے۔

نویں چیز قومی زندگی سے کرپشن کا خاتمہ اور اس کے لیے ہر سطح پر موثر مہم ہے۔

آخری اور بہت ہی ضروری چیز ایک نئی سماجی اور معاشی پالیسی ہے جس کا ہدف صحیح تعلیم کا فروغ، علاج کی سہولتوں کی فراہمی، غربت اور بے روزگاری کا خاتمہ اور روزگار کے مواقع کی فراہمی اور ایسی معاشی اصلاحات ہیں جن سے سود، قمار اور ہر طرح کے استحصال کا خاتمہ ہو، دولت کی تقسیم منصفانہ ہو سکے اور تمام انسانوں کو زندگی کی جائز ضروریات مل سکیں۔

یہ وہ دس نکات ہیں جن پر عمل کر کے قوم ایک بار پھر اسلام کے حیات بخش نظام کے قیام کے لیے متحد اور سرگرم عمل ہو سکتی ہے اور چمن میں اس کی روٹھی ہوئی بہار واپس آ سکتی ہے۔

وما علینا الا البلاغ

ابھی چلچلاتی دھوپ ہے'
ابھی موسلا دھار بارش ہے'
کیسی کھلی نشانی ہے!
پھر ہر کوئی اللہ پر ایمان کیوں نہیں لے آتا؟
اور یہ بارشیں ----
فصلوں کو بار آور کرتی ہیں
اور انھیں تباہ و برباد بھی کرتی ہیں
یہ بادل اللہ کے حکم کے تحت برستے ہیں
حکمت اور نظام کے تحت' الل ٹپ نہیں
کیا اللہ کے ان فیصلوں کا تعلق ہمارے اعمال سے ہے؟
یقیناً ---- حضرت نوح نے اپنی قوم سے کہا تھا'
اپنے رب سے استغفار کرو، وہ بخشنے والا مہربان ہے
آسمان سے پانی برسائے گا، مال و اولاد سے نوازے گا
تمھارے لیے باغات ہوں گے اور ان کے نیچے نہریں
دنیا بھی ---- اور آخرت بھی (اور کیا چاہیے؟)
ہر ایک خوب جانتا ہے کہ اس کے اور اس کی قوم کے گناہ کتنے ہو چکے ہیں!
پھر وہ اپنے رب کے آگے ہاتھ کیوں نہیں پھیلاتا' پیشانی کیوں نہیں ٹیکتا'
مغفرت کیوں نہیں مانگتا؟

(خیر خواہ)

ملک کی موجودہ صورتِ حال

قرار داد مرکزی مجلس شوریٰ

جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ۷،۸ جولائی کے اجلاس میں اتفاق رائے سے یہ قرار داد منظور کی:

جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ غیر معمولی اجلاس اس بات پر اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت کے اسلام دشمن اقدامات' بڑھتی ہوئی کرپشن اور عوام کش بجٹ کے خلاف ۲۴ جون کو راولپنڈی میں جماعت اسلامی کے پرامن مظاہرے کو کچلنے کے لیے حکومت نے ریاستی تشدد کا بدترین استعمال کیا۔ مظاہرین پر گولیاں اور لاٹھیاں برسائی گئیں اور انھیں نشانہ بنا کر آنسو گیس کے شیل پھینکے گئے۔ ہزاروں افراد کو راستے میں قافلے روک کر یا راولپنڈی پہنچنے پر بلا جواز گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالا اور ان پر جھوٹے مقدمات بنائے۔ محترم امیر جماعت قاضی حسین احمد کے ساتھ پولیس نے انتہائی شرمناک اور نازیبا طرز عمل اختیار کیا۔ مردان میں ایک معروف ترین دینی درس گاہ پر آنسو گیس کے شیلوں کی بارش کر دی گئی۔ ممتاز عالم دین' شیخ القرآن اور جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ و عاملہ کے رکن مولانا گوہر رحمن اور ان کے صاحبزادے کو بلا جواز گرفتار کیا گیا۔ یہ داغ پیپلز پارٹی کے دامن سے کبھی نہیں دھل سکتا کہ اس نے ۲۴ جون کو اپنے ظالمانہ طرز عمل سے تین معصوم' محب وطن اور پاکباز نوجوانوں کو شہید کر دیا۔ حکومت نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کر دیا کہ اس کے فسطائی دور حکومت میں کسی شہری کی جان' مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے اور مظلوم شہریوں کو ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کا دستوری حق بھی حاصل نہیں۔ حکومت کی ڈھٹائی کا عالم یہ ہے کہ اس نے سرکاری ذرائع ابلاغ سے جھوٹا پروپیگنڈہ کیا کہ مظاہرین مسلح تھے اور ان میں افغانی باشندے بھی شامل تھے۔ زیر حراست افراد پر تشدد کر کے ان سے یہ بیان لینے کی کوشش کی گئی کہ ان کا تعلق افغانستان سے ہے اور یہ کہ وہ مسلح تھے' لیکن حکومت اس میں ناکام رہی اور یہ حقیقت سب پر عیاں ہوگئی کہ مظاہرین پرامن تھے اور کسی کے پاس کسی طرح کا کوئی اسلحہ نہیں تھا اور وہ شدید ظلم کے باوجود پرامن رہے اور کسی پولیس اہلکار کو کوئی خراش بھی نہیں آئی۔ ۳ جولائی کو ملک بھر میں ہونے

والے بڑے بڑے پرامن مظاہروں نے حکومت کے جھوٹ کو مزید بے نقاب کر دیا۔

موجودہ حکومت نے اپنے اقتدار کے تقریباً تین سال پورے کر لیے ہیں جن میں قوم کو معاشی بدحالی، مہنگائی، بے روزگاری اور بدامنی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اس سے زیادہ تشویش ناک بات ہمارے لیے یہ ہے کہ حکومت ایک منصوبے کے تحت آئین سے انحراف کرتے ہوئے نظریہ پاکستان کو ذہنوں سے فراموش کرا دینا چاہتی ہے۔ وہ ملک کے اسلامی تشخص کو مجروح کر رہی ہے اور اس کی مسلسل کوشش ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایک لادین سیکولر مملکت میں تبدیل کر دیا جائے۔ نوجوان نسل کو ٹی وی کے ذریعے گمراہ اور بدراہ کیا جا رہا ہے۔ مومن اور مجاہد بنانے کے بجائے انھیں گویّا اور رقاص بنایا جا رہا ہے۔ ملک میں صنعتیں بحران کا شکار ہو کر بند ہو رہی ہیں، لیکن شراب کشید کرنے کے نئے کارخانے قائم کیے جا رہے ہیں۔ خالص مسلم آبادی میں شراب کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کو ایک بے جان اور معطل ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ اپنے اس پروگرام میں حکومت اس درجہ جری ہو گئی ہے کہ اس نے اپنے انتخابی پیکج میں جداگانہ انتخابات کے بجائے مخلوط طرز انتخاب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینے کا وعدہ کیا اور دھاندلیوں کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے کے لیے ووٹ ڈالنے کے لیے شناختی کارڈ کی پابندی ختم کرنے کی بات کی۔ وفاقی کابینہ نے اپنے حالیہ اجلاس میں قرآنی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے سفارش کی کہ خواتین کے لیے موت کی سزا ختم کر دی جائے۔ جبکہ وزیراعظم کئی بار حدود کے قوانین کو ظالمانہ اور وحشیانہ کہہ چکی ہیں۔ حکومت نے توہین رسالتؐ میں ملوث افراد کو رہا کر کے فوراً بعد بیرون ملک روانہ کر دیا جہاں وہ پوری دنیا میں پاکستان اور اسلامی قوانین کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

منتخب وزیراعظم عملاً آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے احکام کی تابع ہیں۔ رواں سال کا بجٹ حکومت نے نہیں، بلکہ ان اداروں نے ہی بنایا ہے۔ پاکستانی صنعت کاروں اور تاجروں کے نمایندوں سے مذاکرات میں جو مطالبات حکومت نے مان لیے تھے ان پر بھی یہ کہہ کر عمل نہیں کیا گیا کہ بجٹ میں کوئی تبدیلی، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی رضامندی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ ہماری آزادی قرضوں کے بدلے رہن رکھ دی گئی ہے۔ ہماری آمدنی کا تقریباً ۷۰ فیصد قرضوں اور سود کی ادائیگی پر صرف ہو جاتا ہے۔ لیکن حکومت سرکاری خزانے میں خورد برد اور کرپشن کے واقعات کی روک تھام، ڈوبی ہوئی رقوم کی وصولیابی اور اپنے غیرپیداواری اخراجات میں کمی کرنے کے بجائے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈال رہی ہے۔ پسے ہوئے عوام پر چالیس بلین روپے کے نئے ناقابل برداشت ٹیکس لگا دیے گئے ہیں۔ جنرل سیلز ٹیکس دراصل عمومی موت کا پروانہ ہے۔ سنسر کے بجائے حکومت اخبارات و جرائد کو

بھی اسی کے ذریعے کنٹرول کرنا چاہتی ہے۔ حکومت وعدے تو بہت لمبے چوڑے کرتی ہے' لیکن سرکاری ذرائع سے ہی بتایا گیا ہے کہ ہمارے زرمبادلہ کے ذخائر صرف چند ہفتوں کی ضروریات پوری کرنے کے کفیل رہ گئے ہیں۔ بے روزگاروں کو روزگار دینے کے بجائے ملازمین کو ان کی نوکریوں سے برطرف کیا جا رہا ہے۔ کلرکوں اور پنشنروں کو کوئی ریلیف نہیں دیا گیا۔ نئی بھرتیاں میرٹ کے بجائے رشوت اور سفارش کی بنیاد پر کی جا رہی ہیں۔ حکومت نے پروقار اداروں کو بے وقعت بنا دیا ہے۔ سینیٹ' قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں اب محض نمائشی ادارے بن چکے ہیں جن میں قانون سازی کے بجائے صرف آرڈی ننسوں کی توثیق کی جاتی ہے۔

وفاقی حکومت نے عدالتِ عظمیٰ کے ساتھ بھی محاذ آرائی شروع کر رکھی ہے۔ وزیراعظم سپریم کورٹ کے ججوں کے بارے میں انتہائی غیر محتاط زبان استعمال کرتی ہیں۔ اپنے ایک حالیہ بیان میں انھوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اپوزیشن ججوں کو دانہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی طرح سپریم کورٹ کے بلدیاتی اداروں کو بحال کرنے کے حکم کے فوراً بعد پنجاب اسمبلی نے ایک قانون پاس کر کے اس فیصلہ کو غیر موثر بنا دیا۔ حکمرانوں کی کرپشن کی داستانیں زبان زدعام ہیں۔ ایک برطانوی اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ سرے میں وزیراعظم نے ساڑھے تین سو ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا ایک عالی شان محل خریدا ہے۔ اگر یہ خبر غلط ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس اخبار کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ ایسا نہ کرنے سے شکوک میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ سٹیل مل اور طیاروں کی خریداری سمیت ملک کے بڑے بڑے سرکاری اداروں میں کرپشن کی داستانیں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں' لیکن حکمرانوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

حکومت کشمیر کا مسئلہ حل کرائے بغیر بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی مظالم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور پاکستان نے تجارتی میدان میں بھارت کو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ملک قرار دے دیا ہے۔ وہاں سے شکر اور آلو درآمد کیے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان مسلم ممالک سے بھارت کا تجارتی مقاطعہ کرنے کی اپیل کرتا تاکہ اسے کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ اس لیے حکومت کا یہ دعویٰ کہ اس نے کشمیر کے مسئلے کو زندہ کر دیا ہے' محض ایک ڈھونگ ہے۔ حکومت پاکستان کی کوشش ہے کہ پاکستان اکیسویں صدی میں معاشی اور اقتصادی لحاظ سے بیرونی ممالک کا غلام اور نظریاتی اعتبار سے ایک سیکولر ملک کی حیثیت سے داخل ہو' جہاں حکمران عیش کر رہے ہوں اور عوام اپنے مسائل اور دکھوں کے باعث بے دم ہو چکے ہوں۔ موجودہ حالات یہ ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ پیپلز پارٹی کی اسلام دشمن' کرپٹ اور ظالم حکومت حق حکمرانی کھو چکی ہے۔ اور یہ حکومت اور ملک دونوں ایک

ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس ظالم حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے فوراً برطرف ہونا چاہیے' لیکن اس کے ساتھ اس بات کا اہتمام اور انتظام بھی ضروری ہے کہ آیندہ حکومت بھی موجودہ حکومت ہی کا ایک چربہ ثابت نہ ہو سکے۔ پچھلے دس برسوں میں حکومتوں میں چار بار تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن عوام کے مسائل حل نہیں ہو سکے۔ اس لیے ایسے لاحاصل انتخابی عمل پر سے بھی عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ آزاد کشمیر کے حالیہ انتخابات کے نتائج بھی یہی ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ نظام کے تحت انتخابات کے ذریعے کوئی مثبت تبدیلی ممکن نہیں۔ انتخابات کے ذریعے کسی تبدیلی کے حصول کے لیے یہ یقین دہانی ضروری ہے کہ نئے انتخابات پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی' فلاحی اور جمہوری ملک بنانے پر منتج ہوں گے۔ اس لیے شوریٰ کا یہ اجلاس تجویز پیش کرتا ہے کہ بہتر تبدیلی کی خواہشمند اپوزیشن جماعتیں پہلے آئین کی حدود کے اندر کسی ایسے انتخابی پیکج پر متفق ہوں جن کے نتیجے میں آیندہ انتخابات ایک خود مختار' آزاد کل وقتی الیکشن کمیشن کی نگرانی میں متناسب نمایندگی کی بنیاد پر منعقد ہوں جن میں صرف وہی افراد آگے آسکیں جو دستور کی دفعات ۶۲ اور ۶۳ کی ضروریات پر پورے اترتے ہوں۔ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں جماعت اسلامی کسی انتخابی اتحاد کے حق میں تو نہیں ہے لیکن جو جماعتیں مثبت انتخابی نتائج کے لیے کسی پیکج پر متفق ہو جائیں ان کے ساتھ تعاون کیا جا سکتا ہے۔

نظام کی مثبت تبدیلی اور سیاسی تطہیر کے لیے اس بات کی بنیادی ضرورت ہے کہ تمام موجودہ اور سابق منتخب نمایندوں اور بیوروکریسی کے احتساب کے لیے مستقل احتسابی کمیشن تشکیل دیا جائے جو چیف جسٹسز کمیٹی یا ریٹائرڈ سینئر ججوں پر مشتمل ہو اور وہ افراد جو انتخابی امیدوار بننا چاہیں' انھیں آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ کے معیار پر پرکھا جائے۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ حکومت کے ظلم' جبر' تشدد اور بے گناہ افراد کو قتل' زخمی اور گرفتار کیے جانے کے باوجود جماعت اپنی پرامن جدوجہد جاری رکھے گی۔ نیز مجلس شوریٰ ملک کے مظلوم عوام اور ہم خیال دینی و سیاسی جماعتوں سے تعاون کی اپیل کرتی ہے۔

احکامِ شرعیہ کی حکمت

ا۔ یہ امر مسلّم ہے کہ شریعتِ حقہ کی بنیاد حکمت اور مصلحت پر قائم ہے۔ شارع حکیمؒ نے کوئی حکم بھی بے معنی اور بے مقصد نہیں دیا ہے' نہ کسی حکم کو بجالانے کا طریقہ مقرر کرنے میں کہیں حکمت و مصلحت کو نظرانداز کیا ہے۔ جب یہ مسلم ہے تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت کا صحیح اتباع تفقہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ کسی کام کا حکم دینے یا کسی فعل سے منع کرنے میں شارعؒ کے پیش نظر کون سا مقصد اور کون سی مصلحت ہے' اور جو شخص یہ نہیں سمجھتا کہ کسی حکم کی بجا آوری کے لیے شارعؒ نے جو عملی صورت مقرر کی ہے اس خاص صورت میں کیا حکمت مدنظر ہے' اور اصل مقصد کی تحصیل میں کون کون سا جزئیہ کس کس حد تک مددگار ہوتا ہے' اس کے لیے زندگی کے مختلف احوال میں شریعت کا صحیح اتباع کرنا بہت مشکل بلکہ تقریباً محال ہو گا۔ اس کے پاس شریعت کا صرف جسم ہو گا' اس کی روح نہ ہوگی۔ وہ محض استخوان کا مالک ہو گا' مغز کو نہ پا سکے گا۔ بعض حالات میں نہیں بلکہ اکثر حالات میں وہ اس طرح عمل کرے گا کہ بظاہر تو وہ شارعؒ کے احکام کی پیروی ہوگی' مگر درحقیقت شارعؒ کے اصلی مقاصد فوت ہو جائیں گے' کیونکہ اس کی نگاہ احکام کی مجرد عملی صورتوں اور ان کے جزئیات پر ہوگی۔ ان احکام میں جو مصالح اور مقاصد پوشیدہ ہیں وہ اس کی نظر سے اوجھل ہی رہیں گے' پھر کس طرح وہ مقاصد و مصالح کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر و تبدیل کر سکے گا؟

۲۔ یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارعؒ نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام ازمنہ و امکنہ اور تمام احوال میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے' لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں' ان کو ہوبہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا ردوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک موٹی سی مثال لے

لیجیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لیے سورج کی حرکت کے لحاظ سے اوقات مقرر فرمائے ہیں' اس لیے کہ عرب اور ربع مسکون کے بیشتر حصوں کے لیے تعین اوقات کی یہی صورت مناسب ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قطبین کے قریب رہنے والوں کے لیے بھی نمازوں کے اوقات متعین کرنے میں وہی سورج کے طلوع و غروب اور سایہ کے اتار چڑھاؤ کا لحاظ کرے تو بظاہر یہ شارعؑ کے منصوص احکام کی حرف بحرف پیروی ہوگی' مگر در حقیقت اس سے شارعؑ کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اس کا شمار خلاف ورزی احکام میں ہوگا۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ترک صلوٰۃ اور اسقاط فرض ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالتہ النص اور اشارۃ النص تو درکنار' صراحتہ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضا یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارعؑ کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے' اور انھی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارعؑ کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرز عمل سے اقرب ہو۔

۳۔ مگر تفقہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان محض اپنی عقل و فہم کی پیروی کرنے لگے اور اس کے پیچھے پیچھے جدھر چاہے نکل جائے خواہ وہ حدود و شریعت سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی عقل پرستی وہ چیز نہیں ہے جس کو اسلام کی اصطلاح میں "تفقہ" کہتے ہیں' بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن اتباع ہوا کہا گیا ہے۔ ہواپرستی کی لازمی خصوصیت افراط پسندی ہے' اور اسلامی تفقہ کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال اور توازن ہے۔ ہواپرست ہر معاملہ میں کسی ایک مصلحت یا ایک فائدہ کا ایسا شیدائی بن جاتا ہے کہ اس کی خاطر دوسرے مصالح اور فوائد سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے تفقہ اسلامی تمام مصالح اور فوائد کا مناسب لحاظ کرتا ہے' اور کسی مصلحت کو اگر نظرانداز بھی کرتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ کوئی عظیم تر مصلحت چھوٹی مصلحت کی قربانی چاہتی ہو۔ پھر مصلحت اور مضرت کے معیار میں بھی اسلامی تفقہ اور ہواپرستی کے درمیان اختلاف ہے۔ ہواپرست اسلام کے معیار پر نہیں بلکہ اپنی رجحان طبع کے معیار پر مصلحت و مضرت کا تعین کرتا ہے اور مصالح میں بعض کو اہم اور بعض کو غیر اہم قرار دیتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی تفقہ کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کی نظر اسلام کی نظر ہو۔ آپ اس چیز کو مصلحت سمجھیں جسے اسلام مصلحت سمجھتا ہے اور اس چیز کو مضرت سمجھیں جسے اسلام مضرت سمجھتا ہے' اور مختلف مصالح اور مضرات کے درجے مقرر کرنے میں وہی معیار مدنظر رکھیں جو اسلام کے پیش نظر ہے۔ پس کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ مجرد عقل پرستی کا نام تفقہ ہے اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی عقل کی پیروی میں شریعت کے جس حکم کو جس طرح چاہے بدل لے۔ ہرگز نہیں اور یقیناً نہیں۔ اسلامی تفقہ یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی نگاہ میں جس چیز کو مصلحت سمجھتے ہیں اس کی خاطر ان بہت سی مصلحتوں کو قربان کر دیں جنھیں شارعؑ نے اپنے احکام میں ملحوظ رکھا

ہے یا آپ بزعم خود جس معزت کو اہم سمجھتے ہیں اس سے بچنے کے لیے ایسی بہت سی معزتوں کو قبول کرلیں جن سے شارعؐ آپ کو بچانا چاہتا ہے بلکہ اسلامی تفقہ یہ ہے کہ آپ شارعؐ کی تمام مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں' اور ان میں سے ایک ایک کو وہی اہمیت دیں جو خود شارعؐ نے دی ہے' اور جزئیات میں تغیر و تبدل اس طور پر کریں کہ شارعؐ کے قائم کیے ہوئے توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ یاد رکھیے کہ شارعؐ کے تجویز کردہ طرز عمل میں تغیر صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ تغیر احوال کی بنا پر اس کی پیروی سے کوئی ایسی مصلحت فوت ہوتی ہو جو آپ کے شخصی رجحان کے لحاظ سے نہیں بلکہ خود شارعؐ کے نقطہ نظر سے اہم ہو۔ پھر ایسی صورت میں بھی صرف اس حد تک جزئی تغیر کیا جا سکتا ہے کہ اس اہم تر شرعی مصلحت کی حفاظت کے ساتھ دوسری شرعی مصلحتوں کو نقصان نہ پہنچے یا اگر پہنچے بھی تو وہ ایسی مصلحتیں ہوں جو شارعؐ کی نگاہ میں نسبتاً زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں۔

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے تربیت یافتہ بزرگوں کے عمل سے احکام کے استنباط میں ایک قاعدہ کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "شرعی عمل" اور "طبیعی" یا "عادی عمل" میں فرق کیا جائے۔ شرعی عمل سے مراد ایسا عمل ہے جو اس بنا پر اختیار کیا گیا ہو کہ شریعت کا منشا وہی خاص طرز عمل اختیار کرنے سے پورا ہوتا ہے اور طبیعی یا عادی عمل سے وہ طرز عمل مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے اپنے شخصی و طبیعی رجحان یا اپنے خاص زمانے اور ملک کے اجتماعی حالات کے اقتضا سے اختیار کیا تھا۔ یہ دوسری قسم کا طرز عمل متعدد حیثیات سے ہمارے لیے سبق آموز اور موجب رشد و ہدایت ہو سکتا ہے' مگر اس سے شرعی احکام کا استنباط درست نہیں۔ دلیل شرعی صرف پہلی قسم ہی کا طرز عمل ہے۔ بعض معاملات میں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہوتا ہے' حتیٰ کہ ہر شخص سرسری نظر میں اس کو سمجھ سکتا ہے' مگر بعض امور' خصوصاً دینی امور میں یہ دونوں طرز عمل اس درجہ مخلوط ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے' اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک قسم کے طرز عمل کو دوسری قسم کے طرز عمل کی حیثیت سے لینے اور اس سے غیر مناسب نتائج اخذ کرنے کی غلطی اکثر پیش آئی ہے۔ اور بڑے بڑوں کو پیش آئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی وقت میں رسول بھی تھے' ایک انسان بھی تھے اور ایک عرب بھی تھے۔ ایک خاص زمانہ اور خاص اجتماعی ماحول کے رہنے والے بھی تھے۔ آپ کے ہر فعل میں' خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی' یہ سب حیثیتیں ایک ساتھ موجود تھیں۔ ان مختلف حیثیات کے مخلوط ہونے کی وجہ سے یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی فعل میں کون سا حصہ آپؐ کی حیثیت رسالت سے تعلق رکھتا ہے تاکہ اسے حجت شرعی بنایا جائے۔ اور کون سا حصہ آپ کی دوسری حیثیات سے متعلق ہے جو حجت شرعی

نہیں۔ اس سے زیادہ اختلاط حیثیات صحابہ کرامؓ کے افعال میں ہے۔ ہمارے لیے ان کے عمل میں شرعی رہنمائی صرف اس حیثیت سے ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ تربیت پائی ہے اور آپؐ سے احکام شریعت کا براہ راست استفادہ کیا ہے۔ اس حیثیت کے علاوہ ان کی دوسری حیثیات جس قدر بھی ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں' بہرحال کسی شرعی ہدایت کی حامل نہیں۔ اب ان کے افعال میں خصوصاً دینی افعال میں یہ تمیز کرنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی ہدایت پر مبنی ہے' کون سی ان کی رائے اور اجتہاد پر' اور کون سی ان کے خاص شخصی اور زمانی و مکانی حالات پر۔ یہاں امتیاز کا ذریعہ ہمارے پاس صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت کے وسیع اور غائر مطالعہ سے ہمارے اندر جو اسلامی بصیرت پیدا ہوتی ہے' اس سے ہم شرعی عمل اور طبیعی و عادی عمل کے باریک فرق کو محسوس کرتے ہیں' اور ہمارا ذوق ہم کو بتاتا ہے کہ کون سی چیز طبیعت اسلام سے تعلق رکھتی ہے' اور کون سی اس سے غیر متعلق ہے' کون سی چیز مصالح شرعیہ کی حامل ہے اور کون سی نہیں' کون سی چیز اسلامی سسٹم کا ایک جز ہے اور کون سی نہیں۔ اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجایش ہے' کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی' اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ صرف وہی چیز "شرعی" ہے جس کو اس کی بصیرت شرعی کہہ رہی ہے' اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو "شرعی" کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔

تصاویر قرآنی

ذہنی تصورات و مفاہیم کی تصاویر

سید قطب شہید

تصویر کشی ' قرآن مجید کے اسلوب کی سب سے عمدہ اور نمایاں خصوصیت ہے ' اور قرآنی مطالب کو ذہن نشین کرانے کا سب سے موثر ذریعہ۔ وہ مطالب و معانی ہوں جو فکری و ذہنی ہوتے ہیں' یا انسان کے نفسیاتی حالات و کیفیات ' واقعات و حوادث ہوں یا انسانی کردار اور طبیعتیں ' قرآن ان سب کو ایسی تصویروں کی صورت میں پیش کرتا ہے جو ہم چشم تصور سے دیکھ سکتے ہیں 'محسوس کر سکتے ہیں۔پھر وہ جو تصویر کھینچتا ہے ' اس میں رنگ بھرتا ہے ' اس میں جان ڈالتا ہے ' اس میں زندگی و حرکت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک ذہنی معنی متشکل اور متحرک ہو کر سامنے آجاتے ہیں ' نفسیاتی حالت ایک منظر کی صورت اختیار کر لیتی ہے ' ایک انسانی کردار زندہ شخص بن کر آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جاتا ہے ' انسانی طبیعت کو مجسم دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قرآنی تصویر کے ذریعے ' ہونے والے واقعات و مشاہدات اور قصص و مناظر ابھر کر آنکھوں کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں ' ان میں زندگی ہوتی ہے ' ان میں حرکت ہوتی ہے۔جب قرآن ان تصاویر میں مکالمہ بھی شامل کر دیتا ہے 'تو تخیل کے تصور کے لیے سارے عناصر جمع ہو جاتے ہیں۔جب وہ ان کو اسٹیج پر پیش کرنا شروع کرتا ہے 'تو سامعین ' ناظرین بن جاتے ہیں ' یہاں تک کہ قرآن ان کو اصل واقعہ کے اسکرین پر پہنچا دیتا ہے۔جب ایک کے بعد ایک منظر آتا ہے ' اور ہر حرکت کے بعد ایک نئی حرکت سامنے آتی ہے 'تو کلام کا سامع ان مناظر میں محو ہو کر بھول جاتا ہے کہ یہ کوئی کلام ہے جو پڑھا جا رہا ہے ' یا مثال ہے جو بیان کی جا رہی ہے ' بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک منظر ہے جو پیش کیا جا رہا ہے ' ایک واقعہ ہے جو وقوع پذیر ہو رہا ہے۔یہ مناظر اسکرین پر نمودار ہوتے ہیں ' اور غائب ہو جاتے ہیں۔

جو تصویر ' ذہنی و فکری مطالب ' نفسیاتی کیفیات ' انسانی کردار یا واقعات کی منظر کشی کرتی ہے ' وہ صرف الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے ' اس میں نہ تو رنگ ہوتا ہے جس کے ذریعے تصویر کھینچی جاتی ہے اور نہ ہی اشخاص و رجال ہوتے ہیں جن میں قوت ناطقہ پائی جاتی ہو۔تو اس بات سے ہم پر یہ راز کھل جاتا

قبولیت حاصل نہیں ہوگی اور وہ جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکیں گے۔ یوں کہنا کہ "قبولیت اور جنت میں داخلہ ان کے لیے ایک امر محال ہو گا"، اس حقیقت کو ادا کرنے کے لیے ایک ذہنی طریقہ تھا مگر اسلوب تصویر کشی اس حقیقت کی تصویر یوں پیش کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (الاعراف ۷: ۴۰)

یقین جانو، جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کی ہے ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔

اس آیت کو پڑھ کر تمھاری نگاہِ تصور کے سامنے دو تصویریں گھومنے لگتی ہیں۔ ایک آسمان کے دروازے کے کھلنے کی تصویر، اور دوسری ایک بہت موٹے رسے کے سوئی کے ناکہ میں جانے کی تصویر۔ موٹے رسے کے لیے یہاں خاص طور پر "الجمل" (اونٹ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ رسے کی موٹائی کی تصویر اور گہری ہو جائے۔ یعنی اللہ کے نزدیک غیر قبولیت اور جنت میں داخل ہونے کے ناممکن ہونے کا مفہوم نفس انسانی کی گہرائی میں اتر جائے، صرف ذہنی راستہ ہی سے نہیں، بلکہ مشاہدے اور احساس کے راستے۔ اب یہ قاری کی قوت احساس کا کام ہے کہ وہ ان دونوں صورتوں کے تصور سے وہ تاثر حاصل کرے جو قرآن کے پیش نظر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ قیامت کے دن کفار کے اعمال کو اس طرح ضائع کر دیا جائے گا گویا ان کا وجود ہی نہ تھا، نہ وہ دوبارہ ان کے ہاتھ آئیں گے۔ اس مفہوم کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا (الفرقان ۲۵: ۲۳)

اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے۔

اس آیت کو پڑھ کر جب اڑتی ہوئی خاک کا منظر تمھارے ذہن میں آتا ہے، تو اعمال کے ضائع ہو جانے کا مفہوم ایک نہایت واضح اور نمایاں تصویر بن کر سامنے آجاتا ہے۔

۳۔ درج ذیل آیت میں اسی مفہوم کی کسی قدر طویل تصویر پیش کی گئی ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَّا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ (ابراہیم ۱۴: ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔

تیز آندھی چل رہی ہے۔ ہوا کی حرکت کی وجہ سے اس تصویر میں مزید حرکت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آندھی کے باعث راکھ اڑ جاتی ہے اور ذرہ ذرہ ہو جاتی ہے، جو پہلے ہی مٹی کے مقابلے میں زیادہ ہلکی اور پریشان ہے۔ وہ پھر یکجا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کفار کے اعمال بھی اس راکھ کی طرح نیست و نابود ہو جائیں گے، وہ کسی طرح ان کے کام نہیں آ سکتے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کو بیان کرنا مقصود ہے کہ جو انفاق نمود و نمایش کے لیے دیا جائے، پھر اس کے بعد جسے دیا جائے اس پر احسان بھی جتلایا جائے اور اسے ستایا جائے، تو نہ اس کا پھل ملے گا، نہ وہ باقی رہے گا۔ اس ذہنی اور معنوی بات کو اس محسوس اور متخیل صورت میں بیان کیا گیا۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ، لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا (البقرہ ۲: ۲۶۴)

اے ایمان والو، اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کی خاطر خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسے ہے جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔

ایک ہموار پتھر کی چٹان نگاہوں کے سامنے ہے، اس کو ایک ہلکی سی مٹی کی تہہ نے ڈھانپ رکھا ہے۔ توقع یہی ہے کہ اس میں سے سبزہ اگے گا۔ لیکن جب اس پر بارش کا پانی گرتا ہے، تو، بجائے اس کے کہ اس مٹی سے سبزہ نمودار ہو اور وہ لہلہائے ــــ جیسا کہ زمین کی فطرت ہے، جب اس پر آسمان کا فیض نازل ہو ــــ چٹان نمودار ہو جاتی ہے اور مٹی کی وہ ہلکی سی تہہ بہہ جاتی ہے جس نے اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور جس سے سبزے اور پھل میوے کی توقع تھی۔

اب دوسری آیت آتی ہے جو ریا کے اور احسان و ایذا سے صدقے کے ضائع جانے کے بالمقابل تصویر سامنے لاتی ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا (البقرہ ۲: ۲۶۵)

بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسے ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس

کے لیے کافی ہو جائے۔

یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ جو مال رضاالٰہی کے حصول کے لیے خرچ کیا جائے وہ ایک باغ کی مانند ہے، جب کہ نام و نمود کی خاطر خرچ کیا ہوا مال مٹی کی ہلکی تہہ کے مماثل تھا۔ وہ مٹی چکنے پتھر کے اوپر جمی ہوئی تھی، جب کہ یہ باغ ایک ٹیلے کے اوپر ہے۔ بارش دونوں صورتوں میں ہوتی ہے۔ مگر پہلی حالت میں اس نے مٹی کو دھو کر صاف کر دیا، اور پتھر میں نشوونما کی کوئی گنجایش باقی نہ رہی۔ اس تصویر میں بارش نے باغ کی سرسبزی و شادابی میں اضافہ کر دیا ہے۔ پہلی تصویر میں بارش پتھر پر ہوئی، چٹان کی چٹان رہ گئی، گویا اس کا بدنما چہرہ کھل کر سامنے آگیا۔ مگر دوسری تصویر میں بارش باغ پر برسی، اور جب بارش کا پانی مٹی کے ساتھ ملا تو پھل میوے نمودار ہوئے۔ اگر بارش نہ بھی ہوتی تو بھی اس میں سرسبزی اگانے کی استعداد موجود تھی۔ اس استعداد کے باعث معمولی بارش سے بھی اس میں کھیتی لہلہانے لگتی اور بارش نہ بھی ہوتی، تو بھی۔

میں اس موقع پر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دونوں تصویروں کے موقع و مقام میں کس قدر ارتباط اور توافق پایا جاتا ہے اور جزئیات میں کس قدر مماثلت ہے، اور ان کے نظم و نسق میں کس قدر محاسن پنہاں ہیں۔ مثلاً پتھر پر مٹی کی ہلکی تہہ جم جانے سے وہ ایذارساں انسان مراد ہے جو نمود و نمائش کے جذبہ سے صدقہ دیتا ہے اور یہ صدقہ کسی حد تک اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے، اس لیے کہ ریاکاری ایک ہلکا سا پردہ ہے جو سخت دل کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ نیز یہ کہ باغ کو ٹیلے پر ظاہر کر کے اس کا تقابل مٹی کی اس ہلکی تہہ کے ساتھ کیا گیا ہے جو صاف پتھر پر جم گئی ہو۔ دراصل اس قسم کی تشریح کے لیے تفصیل درکار ہے، جس کا بیان اپنے موقع پر ہو گا۔

۵۔ پھر اسی مضمون کو دوبارہ یوں بیان کیا گیا ہے:

مَثَلُ مَا يُنفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ

(آل عمران ۳: ۱۱۷)

جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں، اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔

اس آیت میں ایک کھیتی کا منظر کھینچا گیا ہے، جس پر تیز ہوا چل رہی ہے، اس ہوا میں شدید سردی بھی ہے، اور وہ کھیتی اور تمام پھل پھولوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کھیتی والے کا کیا دھرا سب ضائع ہو گیا اور وہ اپنی محنت کا کچھ پھل نہ پا سکا۔ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص حالت کفر میں نیک مقاصد کے لیے مال خرچ کرے اور اجر کا امیدوار ہو، مگر اس کا کفر اس کی

ساری امیدوں کو خاک میں ملا دے۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ صر کے لفظ ' تلفظ اور آواز ہی سے کسی حد تک اس کے مفہوم کا اظہار ہو جاتا ہے۔ گویا چھوٹی چھوٹی توپوں سے گولہ باری کر کے اس کھیتی کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ یہ الفاظ و معانی کا باہمی توافق و تطابق ہے جس پر ہم الگ سے روشنی ڈالیں گے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ صرف وہی کسی پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے اور اس کی آرزو بر لاتا ہے۔ اس کے سوا جن معبودوں کو پکارا جاتا ہے وہ کسی چیز کے مالک نہیں' اور ان کی کسی آرزو کو پورا نہیں کر سکتے' خواہ جس چیز کی انھیں آرزو ہے وہ قریب ہی کیوں نہ ہو۔ اس مفہوم کی کس قدر عجیب و غریب تصویر کھینچی گئی ہے:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ، وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ○ (الرعد ۱۳: ۱۴)

اس کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنھیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انھیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں ہے۔ بس اس طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں۔

ایک زندہ شخص پانی لینے کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے' پانی قریب ہے' وہ منہ سے لگانا چاہتا ہے' مگر نہیں لگا سکتا۔ کتنا ہی ہاتھ پھیلائے اور کوشش کر لے' نہیں لگا سکے گا۔ یہ بڑی جاذب التفات تصویر ہے جو حس و وجدان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ کتنی ہی کوشش کی جائے' اس سے نگاہ کو ہٹانا ممکن نہیں ہے۔ اس سے بہتر تصویر الفاظ کے ذریعے کھینچی نہیں جا سکتی۔

۷۔ بیان یہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے وہ نہ تو سنتے ہیں نہ بولتے ہیں' عقل و شعور اور قوت گویائی سے بھی بے بہرہ ہیں۔ اس لیے ان کے پرستاروں کا ان کو پکارنا بالکل عبث اور بے کار ہے۔ اس مضمون کو بیان کرنے کے لیے جو تصویر کشی کی گئی ہے' وہ اس حالت کو اس طرح ظاہر اور مجسم کر دیتی ہے کہ صرف عبارت کے ذریعے احساس اور نفس پر یہ اثر ڈالنا ممکن نہیں ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (البقرہ ۲: ۱۷۱)

یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ

بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

کفار جن معبودوں کو پکارتے ہیں وہ نہ سن سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ نہ تو ان کی آواز میں تمیز کر سکتے ہیں اور نہ ان کا مقصد سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک تمثیل ہے۔ اس آیت میں ایک جماعت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو معبودوں کو پکار رہی ہے۔ ان کی مبہم آواز معبودوں تک پہنچ رہی ہیں، مگر وہ ان کا مطلب خاک بھی نہیں سمجھتے۔ اس تصویر سے جہاں پکارنے والوں کی غفلت اور ان کی بے سود آہ و پکار کو دیکھا جا سکتا ہے، وہاں پکارے جانے والوں کی بے خبری بھی دیکھی جا سکتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواب دینے کی اہلیت سے بھی محروم ہیں۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کو مقصود یہ ہے کہ اس مضمون کی تصویر کشی کی جائے کہ اللہ کے سوا جن کو بھی لوگ معبود یا کارساز تصور کرتے ہیں وہ حد درجہ کمزور ہیں، ان کے پرستار جس کو ملجا و ماویٰ ٹھہرائے ہوئے ہیں، وہ ان کو پناہ دینے کے بھی قابل نہیں۔ اس صورت حال کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (العنکبوت ۲۹: ۴۱)

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں، ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔

معبودانِ باطل کو پکارنے والے خود بھی کمزور مکڑیوں کی طرح ہیں۔ وہ جھوٹے خداؤں اور کارسازوں کے جس گھر میں پناہ لے رہے ہیں، وہ بھی مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہے اور بے کار ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ اس قدر موٹی سی بات کو بھی نہیں دیکھ رہے۔ گویا عجز و ضعف کے ساتھ ساتھ ان کی جہالت و غفلت بھی قابل دید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک نظر آنے والی بدیہی بات کے سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔

۹۔ اس امر پر روشنی ڈالنا مقصود ہے کہ شرک کرنا ایک ایسے فعل کا ارتکاب کرنا ہے جو بے سروپا ہے اور بنیاد و بقاو قرار سے عاری ہے۔ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے اس کو ایک ایسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو تیز رو ہے مگر اسے حرکت کرنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج ۲۲: ۳۱)

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

اس آیت میں مشرک کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے: وہ ایک لمحہ میں بہت اونچے آسمان سے نیچے گر پڑا۔ کہاں سے گرا، کہاں اٹکا، کسی کو خبر بھی نہیں، اور نہ کسی نے خبرگیری کی۔ پھر وہ زمین پر بھی ٹھہرا نہیں۔ پرندے اس کو اچک لے گئے یا ہوا نے اس کو اٹھا کر ایسی جگہ پھینک دیا جس کا کسی کو علم نہیں۔

۱۰۔ مقصود یہ ہے کہ آخرت میں ان اہل کتاب کی محرومی اور بدنصیبی کو بیان کیا جائے، جن کو ظہور اسلام سے قبل آسمانی کتاب عطا ہوئی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس پر ایمان لانے کا عہد و پیمان بھی باندھا، مگر تھوڑے سے مادی نفع کے لیے اسے یوں نظرانداز کر دیا جیسے سرے سے کوئی عہد باندھا ہی نہ ہو۔ چنانچہ ان کی روز قیامت کی محرومی و بدنصیبی جیسے مضمون کی محسوس تصویر کشی یوں کی گئی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران ۳: ۷۷)

جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیوں کہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالیں ان کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔

اس آیت میں اہل کتاب کی محرومی اور بدنصیبی کا ذکر کیا، مگر محرومی کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے ان علامات کا ذکر کیا جو ان کی بدترین محرومی پر دلالت کرتی ہیں، یعنی اللہ کی رحمت اور محبت سے محرومی اور اس کا درد و الم: اللہ تعالیٰ ان کو شرف ہم کلامی نہیں بخشتا، نہ ان سے بات کرتا ہے، نہ ان پر نگاہ کرم ڈالتا ہے، نہ ان کا تزکیہ کرتا ہے، بلکہ ان کو دردناک عذاب میں مبتلا کرتا ہے کہ یہ سب رحمت، محبت اور کرم سے محرومی کی علامات ہیں۔ (جاری)

[ترجمہ و تدوین: خرم مراد، التصویر الفنی فی القرآن، ترجمہ غلام احمد حریری]

سائنسی اور فنی ترقی کا نظریاتی پہلو

پروفیسر عبد القدیر سلیم

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (الانبیا ۲۱: ۱۱۱)
(اور میں نہیں جانتا، ہو سکتا ہے کہ یہ تمھارے لیے آزمائش ہو اور تھوڑی مدت کے لیے کچھ سامان۔)

"صنعتی انقلاب اور اس کے عواقب، ساری نسل انسانی کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہم لوگوں کی، جو "ترقی یافتہ ملکوں" میں رہتے ہیں، متوقع عمر میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ مگر انھوں نے معاشرے کو عدم استحکام کا شکار کر دیا ہے، زندگی کو بے ثمر بنا دیا ہے، انسانوں کو بے توقیری کا شکار کر دیا ہے، اور وسیع پیمانے پر نفسیاتی آلام و مصائب میں ڈال دیا ہے (تیسری دنیا کے جسمانی مصائب ان کے علاوہ ہیں)۔ اس نے عالم فطری پر سخت بربادی مسلط کر دی ہے۔ فنیات کی ترقی اور نمو کا جاری رہنا، صورت حال کو مزید خراب کر دے گا۔ اس سے نوع انسانی یقینی طور پر زیادہ ذلت و بے توقیری کی شکار ہوگی، اور عالم فطرت مزید بربادی سے دوچار ہو گا۔ امکان یہی ہے کہ اس سے سماجی انتشار اور نفسیاتی اذیتوں میں مزید اضافہ ہو گا، اور ہو سکتا ہے کہ "ترقی یافتہ" ممالک میں بھی جسمانی دکھوں میں مزید اضافہ ہی ہو"۔[1]

Not to Laugh, not to lament, not to curse, but to understand.

Spinozoa.

سائنس اور فنیات میں ترقی کے نظریاتی پہلو پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سائنس اور فنیات کی کوئی سادہ سی تعریف کرتے چلیں۔ اگرچہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ آج کا دور "سائنسی دور" کہلاتا ہے، اور جس دنیا میں آج ہم رہ رہے ہیں، وہ بڑی حد تک جدید سائنس اور فنیات کی ساختہ پرداختہ ہے۔ برق اور برقیات کے کمالات، دیوپیکر مشینیں اور کارخانے، رسل و رسائل کی سہولتیں، طب و جراحی کی حیرت زا کرامتیں، اور پھر بڑے پیمانے پر ہلاکت آفریں ہتھیاروں

میں روز افزوں ترقی، سب اسی سائنس اور فنیات کے کرشمے ہیں، جس نے پرانے "معبودوں" کو معزول کر دیا ہے، اور نئے دیوی دیوتاؤں کا روپ دھار لیا ہے۔ دنیا کی سبھی قومیں انھیں اپنے صحن میں اتارنے اور اپنے سنگھاسن پر بٹھانے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت اور مقابلہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ سائنس اور فنیات وہ طلسمی چھڑی یا الہ دین کا روایتی چراغ ہیں، جن سے غربت، بھوک، بے روزگاری، جہالت اور بیماری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خوش حالی، قوت، خیروبرکت اور مسرتوں کا سنہرا دور شروع ہو گا اور دنیا ہی میں جنت کی ایک نئی بساط بچھا دی جائے گی۔

سائنس اور فنیات کا یہ تصور عوام ہی کا نہیں، بلکہ خواص بھی اس میں شریک ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ سائنس کی تعریف، خود مغرب میں، جہاں جدید سائنس نے جنم لیا، کیا کی جاتی ہے۔

اس مضمون میں سائنس سے مراد وہ فطری علوم ہیں، جو جدید یورپی تہذیب نے لگ بھگ ۳۰۰ سال کے عرصے میں تخلیق کیے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آج کی دنیا کی صورت گری اور اس کی موجودہ حالت (مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے) بڑی حد تک اسی سائنس کی مرہون منت ہے۔ اگر نسل انسانی کو اگلی صدی یا مزید چند سو سال پورے کرنے ہیں، تو آج ہمیں اس سائنس کی بنیادوں کا گہرا شعور حاصل کرنا ہو گا، اور اسے صحیح طریقے سے کنٹرول کرنا ہو گا، کہ جن بڑی حد تک بوتل سے باہر آ چکا ہے، اور بہت سے دانش وروں کے خیال میں اب اس کی واپسی ایک محال خوش خیالی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ابتدائی تہذیبوں میں مذہب، فلسفہ اور سائنس باہم کچھ اس طرح مربوط تھے کہ ان کے علاحدہ علاحدہ تشخص کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب سے کوئی ۶۵۰۰ سال قبل مصر، وسطی امریکہ اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں جن تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں، وہاں مقبروں، مجسموں، اور تحریروں سے ان کی فکر، مذہب اور فنی مہارتوں میں ان کے کیف و کم کا پتہ چلتا ہے۔ ۵ ہزار سال قبل کے اہرام مصر اور وسطی امریکہ میں "انکا" کی تہذیبوں کے آثار، ان کی عمارت سازی، سنگ تراشی، جر ثقیل، ہیئت اور فلکیات میں ان کی ہنرمندی، اور عالمِ طبعی کے گہرے مشاہدے کی خبر دیتے ہیں۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ بہت سی مہارتیں اور ہنر اور بہت سے علوم، جو مصر، وسطی امریکہ، قدیم چین، بابل اور جنوبی ہند کے مندروں، غاروں، تعمیرات اور ان کی چھوڑی ہوئی تحریروں میں جھلکتے ہیں، وہ ایک مرحلے پر جا کر رک سے گئے تھے۔ خود ایشیائے کوچک، یونان اور قدیم روم کے علوم بھی ابتداً جدید مغربی دنیا تک بالواسطہ ہی پہنچے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی، جس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ مغربی تہذیب، فکر اور فلسفہ میں پیوست ہیں، کرۂ ارض پر

۱۰ لاکھ سالہ انسانی وجود کے مقابلے میں تین سو سال سے زیادہ پرانے نہیں۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر مُحیطِ کُل دست رس اور زبر دست غلبہ ' ابھی کل ہی کی بات ہے۔

فطری علوم ' ہنر اور مہارتیں ' ان کی دریافت ' ایک قوم سے دوسری قوم تک ان کی منتقلی کے اثرات ' فرد اور معاشرے کی زندگی کے کسی ایک شعبے ہی تک محدود نہیں رہتے ' بلکہ ان کے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں ' اور وہ فرد اور معاشرے کے نظامِ عقائد و عمل کو بدل کر رکھ دیتے ہیں ' بلکہ اس سارے ماحول میں تغیر برپا کر دیتے ہیں ' جن میں انسان رہنے پر مجبور ہے۔

فنیات یا ٹیکنالوجی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ چیزوں کی ساخت اور عملی کاموں کے کرنے کے منضبط مطالعے کا نام ہے۔ جب کہ انگریزی کی اصطلاح technology دو یونانی الفاظ سے مرکب ہے۔ techne ' جس کے معنی فن (art) ' اور ہنر (craft) کے ہیں ' اور logos جو "لفظ" ' "زبان" اور "فکر" کے معنی رکھتا ہے۔ گویا ٹیکنالوجی فن و ہنر کے بارے میں گفتگو اور تفکر کا یا اس کے مطالعے کا نام ہے۔ جب کہ سائنس دراصل کائنات و مافیہا اور فطرت کے فہم اور اس کی تعبیر کی منظم کوشش کو کہتے ہیں۔ فنیات یا ٹیکنالوجی ' چیزوں کو بنانے اور انھیں استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ جب کہ سائنس کی دلچسپیاں بڑی حد تک نظری ہیں کہ اس کا مطمحِ نظر حصول علم ہے۔ سائنس سے اس مضمون میں ہم "فطری علوم" ہی مراد لیں گے۔ اگرچہ یہ لفظ سماجی علوم کے لیے بھی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بنجامن فرینکلن نے کہا تھا کہ "انسان ' آلہ ساز حیوان ہے"۔ بات اپنے اپنے ادراک کی ہے۔ انسان کو مختلف سوچ اور مختلف دلچسپیاں رکھنے والوں نے مختلف طرح سے دیکھا ہے اور اپنے زاویۂ نگاہ سے اس کی تعریف کر دی ہے۔ اگرچہ انسان ' آلہ ساز کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے ' مثلاً کچھ لوگوں کی مطابق وہ ایک مذہبی حیوان ہے ' یا حسن کار اور حسن داں حیوان ہے۔ مگر یہ بات اہم ہے کہ آلات سازی کی صلاحیت ' اور ان کے استعمال کے ذریعے انسان اپنے فطری ماحول اور اپنی ذات اور معاشرے میں جو تبدیلیاں کر پایا ہے ' وہ ان کے بغیر ممکن نہ تھیں۔ بعض حیوانات بھی کبھی کبھی پتھر اور لکڑی کا استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اپنے مقصد کے حصول کے لیے آلات سازی ' انسان ہی کی امتیازی صفت ہے۔ علمائے اثریات کے مطابق اب سے کوئی ۷۰ ہزار سال قبل انسانوں نے پتھر کے اوزار بنا لیے تھے۔ مٹی سے ظروف سازی کوئی ۲۰ ہزار سال قبل شروع ہوئی اور فلزات کا عہد ۱۰ ہزار سال سے زیادہ پرانا نہیں۔

لیکن فنیات کی یہ ابتدا ' انسان کی عملی ضروریات کے لیے اس کی پیش رفت کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ اب سے ڈھائی ہزار سال قبل ہمیں عمارت سازی ' مجسمہ سازی ' ظروف سازی ' رنگ سازی

اور اس طرح کی جو فنیات نظر آتی ہیں، ان میں نظری سائنس کا دخل کم ہی تھا۔ ٹیکنالوجی بڑی حد تک عملی مہارت ہی کی مرہون منت تھی۔ آج ہم جسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں، اس کی ابتدا انیسویں صدی ہی میں ہو سکی ہے۔ جب سائنس دانوں کی دریافتوں کو عملی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس کی سب سے زیادہ واضح مثال ایڈیسن کی ہاں ملتی ہے۔ اس نے برق سے متعلق فیریڈے کے تجربات کو بنیاد بنا کر برقی روشنی کا سب سے پہلا نظام قائم کیا۔ اسی طرح گراہم بیل نے پہلے ٹیلی فونی نظام کی بنیاد رکھی، اور مارکونی نے ہرٹز اور میکس ویل کے تجربات اور علمی دریافتوں کی بنیاد پر بے تار برقی رو کی ٹیکنالوجی کی ابتدا کی۔ تاہم بعض علمائے انسانیات کو، اس اعتراف کے باوجود کہ ٹیکنالوجی کی اصطلاح سترہویں صدی سے پہلے نظر نہیں آتی، اس امر پر اصرار ہے کہ فنیات کی عمر بھی وہی ہے، جو انسان کی ہے اور مذہب اور فلسفے کی طرح یہ بھی اس کی فطری ساخت کا ایک غیر منفک جزو ہے۔

اس مضمون میں میرا ارادہ سائنس اور اس کی برکات، حرفت و فنیات کے کمالات کی حمد و ثنا یا ان سب کی تنقیص و استرداد نہیں ہے۔ ان دونوں جہات سے بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ خصوصاً سائنس کے معجزات، انسانی زندگی کے بوجھ کو کم کرنے، اس میں آسانیوں اور فراوانیوں کے فراہم کرنے اور اسے لذتوں اور خوشیوں سے ہم کنار کرنے میں اس کے کردار پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اب تیسری دنیا کے "ترقی پذیر" ملک اس مستقبل کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جو اس شجر علم کے شیریں ثمرات کی صورت میں انھیں مل سکتا ہے۔

سائنس نے انسانی زندگی کو جن مشقتوں کے بوجھ سے آزاد کیا ہے، اور جو سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی ہیں، عموماً یہی اس میں مزید انہماک، مزید وسائل اور تحقیق و تفتیش کے لیے جواز پیدا کرنے کے لیے کافی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مغربی مفکرین کے ایک خاصے بڑے گروہ نے سائنسی فکر کے لیے ایک اور قابل غور جواز مہیا کیا ہے: سائنسی فکر، طریق کار اور رویے سے فطرت انسانی اور سماجی مسائل پر غور و فکر کے لیے زیادہ مثبت، معروضی اور باثمر راہیں کھلتی ہیں، جن سے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حکمت عملی اور اہداف کا بہتر تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔

یورپ میں سائنس کے خلاف تحریکیں بھی نئی نہیں۔ ولیم بلیک، جوہان وولف گینگ فان گوئٹے سے لے کر نٹیل پوسٹ مین، برے آن ایبل یارڈ اور "یونا بامبر" تک ہمیں ناقدینِ جدید سائنس کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ لیکن فرنکس ٹائن کا کردار تخلیق کرنے والے سائنس دشمنوں اور آج کے ناقدینِ سائنس میں کئی جہتوں سے فرق ہے۔ آج کے ناقدین میں سے بہت سے، بیسویں صدی میں فوجی فنیات اور سائنس میں غاصب، ظالم اور اخلاق و اقدار سے عاری حکمرانوں یا حکومتوں کی دلچسپی اور ان کی مالی امداد (بلکہ وسائل کو بے محابا جھونکنے) کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور دعویٰ کرتے ہیں

کہ سائنس اور اہل سائنس جو کچھ کر رہے ہیں، وہ حصول حکمت و دانائی کی وہ معصومانہ عبادتیں نہیں، جن کے پیچھے ایک عام انسان کی فلاح اور اس کی مصیبتوں کو رفع کرنے کا انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہو۔ سائنس دان کا یہ دعویٰ کھوکھلا اور منافقانہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنس تو اخلاقی طور پر بے رنگ اور غیر جانب دار ہے، پس اس کے غیر ذمہ دارانہ اور انسان دشمن استعمال کے لیے ہم جواب دہ نہیں ہیں۔ ناقدین دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنسی اور فنیاتی پیشوں سے متعلق بڑے بڑے اداروں اور صنعتی، اقتصادی اور سیاسی قوتوں کے درمیان گٹھ جوڑ کچھ نیا نہیں ہے۔ سائنس دانوں میں اخلاقی رمق موجود ہے تو انھیں اس کا احساس کرنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، ان کی تحقیق اور دریافتوں اور ایجادات کے کیا نتائج و عواقب سامنے آ رہے ہیں، اور ممکنہ طور پر مستقبل میں کیا پوشیدہ ہے۔

کیا یہ بات دلچسپ نہیں کہ آج کے شعور کے مطابق ایک سائنس دان، موجد اور فنیاتی، اپنے علم اور تکنیک کے مضمرات کے لیے کسی بھی شخص یا ادارے کے آگے جواب دہ نہیں؟

اگر ارتقائے انواع کا ڈارونی نظریہ انسان کو محض ایک Naked Ape کے زمرے میں ڈال دیتا ہے، اگر کرداری نفسیات اسے چوہے اور کتے کی سطح پر لا کر محض ایک "مہیج ردعمل" والا عضویہ ثابت کر دیتی ہے، اگر جینیاتی دریافتوں سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ہم جنسی کوئی قابل نفریں اخلاقی جرم نہیں، بلکہ محض ایک مختلف جینیاتی بندوبست سے پیدا ہونے والی جسمی، ذہنی کیفیت ہے۔ اگر جینیاتی انجینیرنگ کے ذریعے مطلوبہ جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی خصوصیات رکھنے والے انسان پیدا کرنے کی تکنیک پروان چڑھائی جا سکتی ہے، اگر جرثومۂ حیات کے منجمد ذخیروں سے استفادہ کر کے مویشیوں کی طرح انسانوں کی بہتر نسلیں پیدا کی جا سکتی ہیں، تو یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ سائنس، اپنے سے بڑھ کر کسی اعلیٰ تر قدر کی قائل نہیں۔ "علم قوت ہے" (فرانسس بیکن)، اور قوت خیر ہے، اور خیر کی کثیر تر مقدار کا حصول، لازماً مطلوب ہونا چاہیے۔

اسلامی فلسفہ حیات و کائنات اس بے لگام اور مطلق نظریہ علم کو قبول نہیں کرتا۔ دوسرے ماہرین کی طرح سائنس دان اور ٹیکنوکریٹ بھی معروف اور منکر کی ان حدود کے پابند ہیں، جو قرآن مجید اور حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کر دی ہیں۔ میرے خیال میں وہ ساری سائنس اور فنیات ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہونی چاہییں جن کے مہیا کردہ علوم اور مہارتیں امکانی طور پر انسان کے خلاف استعمال ہو سکتی ہوں، یا اسے اس شرف و کرامت سے محروم کرتی ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے۔ اس طرح انسانی جنین پر ہر طرح کے تجربے، انھیں مستقبل کی پیوند کاریوں کے لیے موادِ وسائل (resoruce material) کے طور پر استعمال کرنا، پروزیک، میسکی لین اور LSD جیسی ادویات کی ترقی، جو انسان کے شعور کو تبدیل کر دیتی ہیں، ہرگز قبول نہیں کی جا سکتیں۔

اسلام کے نظریۂ علم کے مطابق حقیقی علم کا ہدف منشائے الٰہی کو سمجھنا ہے، اور انسان کی سعی و جہد کی درست سمت، اپنے اس علم کی روشنی میں اور اس کی مدد سے اپنے مالک کی مرضی کو اس دنیا میں پورا کرنا ہے۔ اسی کے نتیجے میں حقیقی فلاح، یعنی آخرت کی دائمی کامیابی ممکن ہے۔ ان اہداف کے شعوری احساس کے بغیر علم و حکمت کے حصول کی ساری کوششیں ازدیادِ جہالت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گی۔ تسخیر کائنات اور عناصر پر قابو کی وہ ساری کامیابیاں، جو ان اہداف کے لیے نہیں، محض باطل اور مردود ہیں کہ یہ انسان کو اس کی حقیقی منزل سے دور لے جانے والی ہیں۔

آفاق و انفُس کا وہ سارا علم، جو اللہ کے حوالے کے بغیر ہے، اور جو اس کی منشا کے تصور سے عاری ہے، اسلامی علم یا سائنس نہیں، اور ہمارے نقطہ نظر سے وہ محض بے وقعت ہی نہیں، بلکہ مضر ہے۔ کیوں کہ یہ وسیع تر سیاق میں علم ہی نہیں، بلکہ نری جہالت ہے۔ اس کے نتیجے میں دنیاوی لذات کا حصول (اگر ہو) ایک نفع عاجل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، جس کی قیمت اسی دنیا میں اربوں انسان ادا کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے زاویے سے دیکھیں، تو اس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کے علاوہ اور کچھ نہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ (سورہ ابراہیم ۱۴: ۲۸، ۲۹)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتار دیا؟ یہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے، جس میں وہ آن پڑیں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

ان آیات کے متعدد مفاہیم اور مصداق میں یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم، صلاحیتوں اور وسائل کی جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان کی ناشکری یعنی غلط استعمال سے سوائے تباہی اور دائمی عذاب کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس کے قائدین ہی اللہ کے نزدیک اصل مجرم ہیں۔ یہ بات توجہ اور غور کی متقاضی ہے کہ بیسویں صدی، جو سائنس و صناعی میں انسانی پیش رفت کی بے مثال صدی ہے، ابتدا سے انتہا تک جنگوں اور بڑے پیمانے پر ہلاکت کی صدی بھی ہے۔[۲] تاریخ میں کبھی انسان کے ہاتھوں انسان کی بربادی کے یہ نظارے چشم فلک نے نہیں دیکھے۔ پھر ٹیکنالوجی نے یہ نظارے ٹی وی اور ابلاغِ عامہ کے نت نئے وسائل کے ذریعے عام گھروں میں پہنچا دیے۔ لوگ خلیج کی جنگ، اوکلاہوما کی بم باری، افغانستان، کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا میں انسان کے ہاتھوں انسان پر درندگی کے منظر اس طرح دیکھتے ہیں، جیسے یہ کوئی فرضی ڈرامائی تشکیل ہو۔

سائنس اور دوسرے سماجی علوم میں وہی پالیسی اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہوگی، جو فرد اور

پوری انسانیت کے اصل ہدف 'یعنی فلاح اخروی کے حصول میں مدد و معاون ہو۔

اب ذرا "ترقی" کے لفظ کی طرف آیئے۔

ترقی (development) کی اصطلاح اپنے جدید مفہوم کے اعتبار سے ۱۸ویں '۱۹ویں صدی سے پہلے مغربی زبانوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ اس کا رواج مغرب میں سائنس اور فنیات کے عہد سے ہوتا ہے' جب تحقیق و ترقی (research & development) کے نتیجے میں اول الذکر نے کائنات کی مابعد الطبیعی مذہبی بنیادوں کو ڈھا دیا' اور ثانی الذکر نے انسان کو مشین کے ذریعے تیز رفتاری' سہولتِ کار اور نئے ذرائع پیداوار سے آشنا کیا۔ آج یہ اصطلاح نہ صرف مغرب بلکہ ساری دنیا کا روزمرہ بن گئی ہے۔۳؎ اس لفظ نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: "ترقی یافتہ اقوام" اور "غیر ترقی یافتہ اقوام" (ترقی پذیر اقوام کی دل خوش کن اصطلاح 'ان قوموں کے نصیب میں آئی' جو بزعم خود مغرب کو ماڈل بناکر اس جیسا بننے کی کوشش میں مصروف ہیں)۔ "ترقی" کا لفظ ایک خالصتاً مغربی تصور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے اور مختلف انواع کی تہذیبوں اور ثقافتوں کے فروغ کی بجائے ایک مخصوص تہذیب و ثقافت کے ظہور میں آنے اور بارور ہونے ہی کو مستحسن گردانتا ہے۔ "لغات ترقی" کے مدیر کے مطابق اس لفظ کے استعمال نے "تاریخ کو ایک پروگرام" میں تحویل کر دیا ہے: یعنی ایک لابدی اور تقدیر میں۔۴؎ چوں کہ مادی فلسفہ علم و فن کے جلو میں پلنے بڑھنے والی سائنس اور فنیات اور صنعتی ترقی کو انسانی خیر و فلاح کے واحد ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے' اس لیے اس کے نتیجے میں تعمیر و ترقی کے مخصوص تصور سے تاریخ کے ایک خالصتاً مغربی نقطہ نظر کا ساری دنیا پر غلبہ ہو گیا ہے۔ اس طرح مختلف اقوام اپنی سماجی زندگی کے مخصوص اسلوب کو فروغ دینے کے مواقع سے محروم یا دست بردار ہوتی جا رہی ہیں۔۵؎

اب سوال یہ ہے کہ تعمیر و ترقی (ارتقا!) کا مغربی مفہوم ہے کیا؟

انیسویں صدی کے وسط میں چارلس ڈارون نے حیوانی ارتقا کا جو نظریہ پیش کیا' اور ہربرٹ اسپنسر نے جس طرح اس کا اطلاق دوسرے شعبوں میں کیا' اس کے بنیادی اصول اور خدوخال قوموں کی ترقی' علوم کی ترقی' فنیات کی ترقی' سماج اور سماجی اداروں کی ترقی کے لیے بھی ویسے ہی درست اور قابلِ اطلاق بتائے گئے۔ ترقی کا مطلب ہے سادہ سے پیچیدہ' ادنیٰ سے اعلیٰ' ناموافق سے موافق کی طرف پیش رفت۔ مگر دنیا کے دو تہائی سے زیادہ انسانوں کے لیے (جو "غیر ترقی یافتہ" ہیں) یہ لفظ ایک ناپسندیدہ اور بے توقیر سماجی رتبے کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس سے نکل بھاگنے کے لیے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ دوسروں کے تجربوں اور خوابوں کے غلام بن جائیں"۔۶؎ سادہ الفاظ میں امریکہ (یا جاپان) ایک ترقی یافتہ ملک ہے' اگر آپ بھی ترقی کرنا چاہتے ہیں' تو آپ بھی وہی کیجیے' جو

امریکیوں (جاپانیوں) نے کیا اور کر رہے ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے "ترقی پذیر" ممالک میں بالعموم اور مسلم معاشروں میں بالخصوص یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ہم مغرب کی کورانہ تقلید نہیں کریں گے۔ہم ان کی سائنس اور فنیات کو تو اختیار کر لیں گے، مگر ان کی سماجی اقدار، خاندانوں کی شکست و ریخت، مغائرت، نفسانفسی، چھین جھپٹ، حرص و ہوس، آزادروی، بے صبری اور مذہب بے زاری کو رد کر دیں گے۔

کیا ایسا ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب ہم دو جہتوں سے حاصل کر سکتے ہیں: سادہ طریق تو یہ ہے کہ ہم ان ملکوں کا جائزہ لیں، جنھوں نے بغیر کسی تکلف اور ہچکچاہٹ کے مغربی سائنس اور فنیات کو اختیار کر لیا۔خوش قسمتی (!) سے ایسی مثالیں بہت واضح اور غیر مبہم طور پر دستیاب ہیں۔ان میں سرفہرست جاپان ہے، پھر ہانگ کانگ، کوریا، تائیوان، سنگاپور، تھائی لینڈ، اور مشرق بعید کے بعض اور ممالک آتے ہیں۔ میجی انقلاب کے بعد جاپانیوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس اور فنیات میں کھلے دل کے ساتھ مغربی طرز کو اپنا لیا۔ آج جاپان اتنا ہی "ترقی یافتہ" ملک ہے، جتنا کہ کوئی مغربی ملک ہو سکتا ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جاپان ایک مغربی ملک ہی بن گیا ہے۔جاپان کی صنعت و حرفت کو جس سائنس و فنیات نے فروغ دیا، اس کی دوسری جہت سرمایہ دارانہ نظام اور منڈی کی معیشت ہے۔یہ نظام بڑے بڑے صنعتی خانوادوں اور اداروں کو جنم دیتا ہے، جن کے آگے چھوٹی صنعتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ پھر جاپان سمیت جہاں بھی یہ سائنسی، صنعتی اور تجارتی انقلاب نمودار ہوا، اس کا اپنا منطقی تقاضا یہ تھا کہ اس سے ہم آہنگ ایک سیاسی، سماجی اور اخلاقی کلچر بھی ظہور میں آئے، سو وہ ہو کر رہا۔جاپان، تائیوان، ہانگ کانگ، اپنی ثقافت اور تہذیب کے اعتبار سے بڑی حد تک مغربی ممالک کی صف میں شامل ہو چکے ہیں۔وہاں فی ہزار آبادی میں بچوں کی پیدائش، شادی اور طلاق، بے شادی خانہ آبادی، بچوں اور بچیوں کے ساتھ زیادتی، روحانی اور نفسیاتی عوارض، خودکشی، تشدد وغیرہ کے اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ بڑا چشم کشا ہو گا، کیوں کہ ان میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر اہل نظر کے نزدیک یہ مماثلت حیرت انگیز نہیں۔

خود مغربی عمرانیات کے مطابق انسان کا خارجی اور طبعی ماحول اور اس کے حالات کار، اس کے سماجی، اخلاقی رویے کی صورت گری کرتے ہیں۔اب یہ بات کسی طرح بھی حیران کن نہیں ہونی چاہیے کہ بھارت، جو "سائنس اور صنعتی ترقی" میں پاکستان سے آگے ہے، اپنے نام نہاد مذہبی کٹرپن کے باوجود نفسانفسی، چھین جھپٹ، جنسی بے راہ روی، تشدد اور اخلاقی زوال میں بھی پاکستان سے آگے ہے، جب کہ برصغیر کے دونوں بڑے مذاہب (اسلام اور ہندومت) کے ماننے والوں کا، اپنے اپنے

مذہب کے بارے میں رویہ مختلف نہ تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے مذاہب کا گہرا رنگ لیے ہوئے تھے 'اور آخر کار یہی حقیقت برصغیر کی تقسیم کا باعث بنی تھی۔ تاہم اب بھارت کا "ترقی پذیر" سائنسی 'صنعتی معاشرہ' وہاں کے باشندوں کے عمومی سماجی 'اخلاقی کلچر پر واضح اثرات ڈال رہا ہے۔ "زی جنریشن" اور بولی ووڈ (بروزن ہولی ووڈ) کلچر" جیسی اصطلاحات بھارت میں فروغ پانے والی نئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ہمارے نظریہ سازوں کو یہ بات بھی شعور میں رکھنی چاہیے کہ سائنس اور صنعت و معیشت کے ملاپ سے مغرب میں جو معاشرہ وجود میں آیا ہے 'اس کا امتیازی نشان "تکاثر" ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ ملکوں میں ایک نچلے یا اوسط طبقے کے انسان کے لیے اپنی حقیقی ضروریات کی تکمیل کے لیے بہت زیادہ محنت اور تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کاموں کی تحلیل اور تقسیم محنت نے 'اس کے لیے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ چند گھنٹے ایک جگہ وہ مشینی انداز میں ایک مخصوص کام سرانجام دیتا رہے ' جیسے اسمبلی لائن کا کارکن 'کلرک یا مخصوص امراض کا طبیب یا استاد۔ مگر صنعت و سرمایہ کے فروغ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے قانع اکثریت کی بجائے ' ہر دم جواں حرص میں گرفتار آبادی میسر ہو' جو اس کی نت نئی مصنوعات کے لیے تابع دار صارفین کا کردار ادا کرتی رہے۔ میڈیا' خصوصاً برقیاتی ذرائع ابلاغ نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی۔۸ چنانچہ جدید اشتہاری تکنیک اور بازار کاری کے نت نئے طریقوں سے عوام کو ایسی چیزوں کا خواہش مند اور پرستار بنا دیا گیا' جو کسی طرح بھی ان کی حقیقی ضروریات نہیں ' مثلاً سگریٹ ' مشروبات ' قیمتی گھڑیاں ' کاریں ' غیر ضروری ملبوسات ' مصنوعات آرائش و زیبائش ' بقدر ہمت و ظرف ان کی خریداری کے لیے انھیں مزید محنت کی ضرورت ہوگی 'اور جب ان کی یہ ضروریات پوری ہو جائیں گی 'تو اسی طرح کی دوسری غیر ضروری "ضروریات" سامنے آجائیں گی۔۹ غرض

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۱۰

کا منظر ہے۔ تحقیق و ترقی (R & D) اور صنعت و تجارت کے اس ناپاک گٹھ جوڑ نے "ترقی یافتہ" ممالک کے عوام کالانعام کو ایک ایسے چکر میں ڈال دیا ہے 'جس سے نکلنا کم ہی لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ (جاری)

(انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام سیمینار (۷ جولائی 'کراچی) میں پڑھا گیا)

حواشی

1- Unabomber: Manifesto p .5

۲۔ اس تجزیے کے لیے دیکھیے' John Ralston Saul کی کتاب :

Voltair's Bastards: The Dictatorship of Reason in the West, p.170.

۳۔ مغرب کے غلبے میں زندگی گزارنے والی اقوام کے لیے یہ ناممکن ہو گیا ہے' کہ وہ ان کی زبان اور اصطلاحات سے آزاد ہو کر اپنے لیے کوئی نیا اسلوب اظہار فکر تلاش کر سکیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جن اصطلاحات کے سہارے ہم گفتگو کرتے ہیں' اور جو زبان ہم بولتے ہیں' بڑی حد تک وہی ہمارے اسلوب فکر کا تعین بھی کرتی ہے۔ Wolfgang Sachs کی The Development Dictionary پر ایک نظر ڈالنا مفید ہو گا۔

4- Wolfgang Sachs: The Development Dictionary, Zed Books London 1992, p 9.

5- Ibid, p 9.

6- Ibid, p 10.

۷۔ مختلف ممالک کے تقابلی مطالعے کے لیے دیکھیے: Paul Kennedy: Preparing for the Twenty-First Century, Hammersmith, London, 1994.

۸۔ ذرا تصور کیجیے کہ اہرام مصر کے خزانوں کے حصول کی پر خطر مگر کامیاب کوشش' پولو کے کھیل 'کشتی رانی' سریع الحرکت کاروں کے مقابلے 'گھڑ دوڑ میں جیت' حسین خواتین کے مرکز توجہ بننے کی مسرت میں کیا چیز مشترک ہے؟ --- ایک برانڈ کا سگریٹ یا کوئی نرم مشروب۔

۹۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی اور "لا الہ سیاسی معیشت" کے نتیجے میں وجود میں آنے والی قومی سلطنت (میں اسے یہی کہوں گا) 'ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ مثالی 'ان معنوں میں کہ سبھی ترقی پذیر ملک 'کیا مسلم اور کیا غیر مسلم' اسی کی طرف اپنا قبلہ راست کرتے ہیں' اور اسے ایک نمونے کے طور پر پیش نظر رکھتے ہیں۔ امریکہ کی ترقی کا یہ حال ہے کہ ۱۹۷۳ سے وسط ۱۹۹۵ میں فی کس Real GDP میں ۳۸ فی صد اضافہ ہو گیا' لیکن عام محنت کش (non-supervisory worker) جو کسی کا افسر نہیں 'کی فی ساعت اجرت میں ۱۴ فی صد کمی ریکارڈ کی گئی۔ ۸۰ء کے عشرے میں آمدنیوں کا سارا اضافہ ' ۲۰ فی صد بالائی طبقے کے حصے میں آیا' اور قومی آمدنی کا ۶۴ فی صد (ایک خطیر مقدار) صرف بالائی ایک فی صد طبقہ لے اڑا۔ (دی اکانومسٹ لندن' ۹ مارچ' ۱۹۹۶) --- یہ اس ملک کا حال ہے' جہاں سائنس و فنیات کسی اسٹالن 'ماؤزے تنگ یا صدام حسین کے ہاتھوں میں نہیں' بلکہ انھیں جمہور ادیا گیا ہے۔

۱۰۔ سونے یا پلاٹینم کے ٹھوس بلاک سے تراشیدہ 'ہیرے جڑی ہوئی دست ساز ایک گھڑی کی قیمت چند لاکھ روپے سے زیادہ ہو سکتی ہے اور ایک کار' ایک کروڑ میں --- معمولی سی بات ہے۔

امریکی صیہونی حکمتِ عملی

ڈاکٹر خالد علوی

مسلمانوں کی تاریخ میں اسلامی احیا اور مسلمانوں کے غلبے کا جو تصور مقبول رہا ہے' وہ تجدید دین کی اصطلاح میں پوشیدہ ہے۔ سید مودودی نے اپنی کتاب تجدید و احیا دین میں اس حوالے سے ہونے والے کام کا ایک ایسا جائزہ پیش کیا ہے جسے اسلام کے حرکی تصور کا فہم رکھنے والا انسان نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اقبال نے بہت صحیح کہا ہے:

> ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام کے مطالعہ سے سیکھا ہے یہ ہے' کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا' نہ کہ مسلمان۔ مسلمان اگر آج اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرنو جمع ہو جائیں گی۔ اور آپ کا وجود ہلاکت اور بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ (خطبات اقبال' ص ۶۴)

ہر صدی کے سرے پر مجدد کی بعثت کی جو خبر حضور اکرمؐ کی طرف منسوب ہے وہ اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس میں تزکیہ کا ایک خودکار نظام موجود ہے جو ملت اسلامیہ کے اجتماعی شعور کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اسلام کی بقا' ختم نبوت کی حفاظت اور اسلام کے فکری غلبے کی بنیادی علامت یہ ہے کہ ان امتی لا تجتمع علی ضلالۃ یعنی امت مسلمہ کا اجتماعی شعور کبھی کسی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو گا۔ بلاشبہ مسلمان معاشروں میں الحادی تحریکوں' انحرافی گروہوں' گمراہیوں اور بدعات کا فروغ بھی ہو سکتا ہے' لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ امت مسلمہ کسی گمراہی' بدعت اور الحادی فکر پر مجتمع ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم تاریخ میں کبھی ایک فرد اٹھتا ہے اور وقت کے اندھیروں اور زمانے کی تاریکیوں کے خلاف مصروف جہاد ہوتا ہے' اور اسلام کے نور کو چہار سو پھیلا دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعی قیادتیں یہ کام کرتی ہیں' اور دیکھتے ہی دیکھتے نور کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں اور اندھیرے پسپائی اختیار کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں امریکی سازشوں اور امریکی عزائم کی بات اتنی عام ہے کہ یہاں پر ہونے والی معمولی سی بات میں بھی امریکی صیہونی سازش نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات ایک مذاق سی بن گئی ہے۔ اس

کے باوجود امریکی اور صیہونی سازشیں ایک حقیقت ہیں' البتہ اس کا ایک پہلو عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے اپنا کم احتسابی کا رویہ - بدقسمتی سے ہم مسلمان ایسے گروہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں' جو اپنے اعمال اور فیصلوں پر تجزیہ کرنے سے پہلو بچاتے ہیں - یہ ایک منفی اور خود فریبی کا رویہ ہے - ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ امریکہ کیا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے؟ صیہونیت کیا ہے اور وہ کیا چاہتی ہے؟ انگریزی میں اس موضوع پر بہت سالٹریچر موجود ہے - Elders of Zion کے نام سے ایک ڈائری چھپی ہے 'جس کے بارے میں یہودیوں کا کہنا ہے کہ "وہ جعلی ہے' ان کے مخالفوں نے اسے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دیا ہے" - جن لوگوں نے اس ڈائری کو پڑھا ہے اور پھر ان حالات کا جائزہ لیا ہے جو عالمی سطح پر ہو رہے ہیں یا مسلم ممالک میں جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں' وہ یقیناً کہیں گے کہ ان حالات سے تو واقعی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ڈائری جعلی ہے تو بھی لکھنے والوں نے یہودیوں کے دماغ کو ٹھیک طور پر پڑھ کر ہی لکھی ہے -

فلسطین میں یہودیوں کو آبادکاری کے لیے برطانوی و امریکی امداد مسلسل حاصل رہی - ۱۸۸۲ سے ۱۹۱۴ تک ۶۵ ہزار یہودی فلسطین میں آباد ہوئے - ۱۹۱۴ میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے ان کی تعداد ۹۰ ہزار تھی - برطانوی دلچسپی کا اندازہ "اعلان بالفور" کے ان الفاظ سے ہوتا ہے: بادشاہ معظم کی سلطنت اس امر کا یقین اور ارادہ رکھتی ہے کہ ارض فلسطین پر یہودی لوگوں کے لیے ایک وطن کی بنیاد رکھے اور اشتراک کے لیے تمام وسائل اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے -

ازمنۂ وسطیٰ (Middle ages) میں یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کے سلوک کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے - اس دور میں یہودیوں پر سب سے زیادہ مظالم عیسائیوں نے کیے - تب یہودیوں نے مسلم سپین' عثمانی ترکوں اور شمالی افریقہ کی مسلمان ریاستوں میں پناہ حاصل کی - لیکن اس قوم نے احسان فراموشی کرتے ہوئے مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچایا - مسلمانوں کے ہاں پناہ کے دوران میں ان کی فکر اور ان کا فلسفہ پروان چڑھا - ان کا اہم فلسفی جو مسلمانوں کی تاریخ میں میمون اور یورپی مورخین کے ہاں Minonides کے نام سے معروف ہے' وہ غزالی کا ہم عصر تھا - یہودی فکر کے ارتقا میں اس کا بڑا موثر رول ہے - اس دشمنی کے باوجود یہودیت سے عیسائیوں کی مفاہمت کیسے پیدا ہوئی' حالانکہ یہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے تھے؟ ان کے درمیان مقاصد کا اشتراک سمجھنے کے لیے عیسائیت کا جائزہ لینا ہوگا -

عیسائیوں کے دو معروف فرقے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہیں - کیتھولک عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ کو سولی پر چڑھانے والے یہودی تھے' لہٰذا یہودی مسیح کے قاتل ہیں اور مسیح کا خون یہودیوں کے سر ہے - اگرچہ اب پوپ نے ان کو اس جرم سے بری کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ مسیح

کی مصلوبیت کا واقعہ ہماری تاریخ میں ہے، لیکن میں یہودیوں کو مسیح کے قتل سے بری کرتا ہوں۔ یہ احکام ویٹیکن ثانی کی دستاویزات مجریہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۵ اور ۷ دسمبر ۱۹۶۵ میں درج ہیں۔

پروٹسٹنٹ گروہ یہودیوں کا حامی ہے۔ ان کی صفوں میں کچھ گروہ Chrisitian Zionist کہلاتے ہیں۔ جنھیں عیسائی یہودی کہنا چاہیے۔ یہ لوگ عیسائیوں میں پھوٹ ڈالنے کا کام کرنے کے لیے ہر قسم کا کام کر سکتے ہیں۔ ان یہودیوں نے عیسائیوں کی صفوں میں داخل ہو کر ایسا کام کیا ہے کہ عیسائی نہ صرف ان کے مقاصد کی تکمیل میں مدد و معاون بن گئے ہیں، بلکہ انھوں نے یہودیوں کے دفاع کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی میں رومی عسکریت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رومن ایمپائر مغربی ذہن سے محو نہیں ہوئی۔ ایک وقت تھا، جب برطانیہ نے اپنے آپ کو رومن ایمپائر کا جانشین سمجھتا تھا اور اب امریکہ اس کی جانشینی کا دعویدار ہے۔ اگر غور کریں تو یہ اینگلو سیکسن پالیسی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ اینگلو سیکسن گروپ ہے۔ برطانوی دانش ور کھل کر کہتے ہیں کہ برطانیہ امریکہ کا سٹیلائیٹ ہے۔ اگر تجزیہ کریں تو پتہ چلے گا کہ اب بھی جو بین الاقوامی پالیسی بنتی ہے اس کی تشکیل اور اس کی تنفیذ میں برطانوی سازش اور برطانوی ذہن کار فرما نظر آتا ہے۔ دوسری طرف تمام معاملات میں امریکہ اور برطانیہ میں گہرا اشتراک موجود ہے۔

اینگلو سیکسن گروپ اور صیہونیت میں گہرا اشتراک عمل پایا جاتا ہے۔ یہ گروپ عالمی غلبہ چاہتا ہے۔ برطانیہ ہی نے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے عملاً مدد کی۔ پھر ۱۹۲۳ میں مینڈیٹ پر عمل درآمد شروع ہوا اور ۱۹۲۵ میں یروشلم میں ہیبریو یونی ورسٹی کا آغاز ہوا تو اس کا سنگ بنیاد لارڈ بالفور نے رکھا۔ اسی شخص نے یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کیا تھا۔

برطانیہ، امریکہ اور صیہونیوں کے منصوبوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کا علم ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جس کے تحت ہم اپنے دشمنوں کی زبان پڑھیں، ان کے لٹریچر کا جائزہ لیں اور اس کے بعد اپنی حکمت عملی مرتب کریں۔ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں کئی ادارے ہیں جو مسلمانوں کی سرگرمیوں اور ان کی حکمت عملیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یورپ کے ایک اہم ادارہ میں مجھے بھی پڑھانے کا موقع ملا۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے لیے مسلمان اور غیر مسلم طلبہ یہاں سے اسلامی مطالعے پر ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ اس ادارے میں ایک شعبہ افریقہ پر ہے، کوئی عیسائی طالب علم یا سکالر آئے تو درست، لیکن کسی مسلمان کے لیے وہاں رسائی ممکن نہیں۔ میں وہاں اتفاقاً چلا گیا تو ڈیوٹی پر موجود کارکن سخت پریشان ہو کر کہنے لگا "میرے لیے مشکلات پیدا ہوں گی، اس لیے آپ منتظم اعلیٰ سے اجازت لے کر آئیں"۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہماری جامعات

اور ہمارے کالجوں میں اسلام کے حوالے سے جو بات ہوتی ہے اس میں ان غیر مسلموں کو اتھارٹی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن' حدیث اور فقہ پر ان کی ہزلیات کو مستند سمجھا جاتا ہے۔

سید مودودیؒ نے اسی المیہ کو دیکھ کر فرمایا تھا: "اب معاملہ الٹا ہو گیا ہے کہ مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے؟ حتیٰ کہ عربی زبان بھی مغربی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے۔ مغربی ممالک سے استاد درآمد کر کے ان سے اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں' نہ صرف اسے پڑھایا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی رائے کو ذرہ برابر بھی دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے" (ترجمان القرآن' نومبر ۱۹۶۱ء' ص ۵۵-۵۶)

آج تک کسی مسلمان نے' سوائے سرسید احمد خاں کے بائبل کی تفسیر نہیں لکھی' اور وہ بھی انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے' تاکہ یہ بتائیں کہ بائبل بھی قرآن کے برابر ہے۔ کسی مسلمان نے ان کی فلاسفی' ان کی تاریخ اور ان کے مذاہب پر اظہار خیال کیا ہو اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہو؟ یہ باب بڑا مایوس کن ہے۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی مسلمان انھیں بائبل پڑھانے کے لیے آئے۔ لیکن وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی یونیورسٹیوں میں اسلام پڑھایا جائے گا اور اسے یہودی اور عیسائی پڑھائیں گے۔ اور اگر مسلمان پڑھائے گا تو اس منہاج اور اسلوب کے مطابق جو مغربی سکالر نے ایجاد کیا ہے۔ سید مودودیؒ نے کہا تھا کہ کوئی یہودی کسی غیر یہودی کو اپنی تاریخ پڑھانے کی اجازت نہ دے گا' لیکن مسلمان اپنی تاریخ کے لیے بھی اور اپنے معاملات کے تجزیے کے لیے بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی تشریحات پر اعتماد کریں گے۔

اسلام' یہودیت اور عیسائیت کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ مسلمانوں کو وہ رشتہ ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ اس رشتے اور اس تعلق کی وضاحت سورہ مائدہ کی اس آیت سے ہوتی ہے:

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ - وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ - اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (المائدہ ۵: ۵۱)

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انھی میں ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

یہودیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے جو عداوت ہے اس کی دو بنیادیں ہیں:

پہلی بنیاد' بقول سید مودودیؒ' یہ ہے کہ آنحضورؐ کی آمد سے انسانیت کی دینی و روحانی قیادت بنی

اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل ہوگئی ہے۔

دوسری بنیاد وہ واقعات ہیں جن کا تعلق یہودیوں کے اخراج سے ہے۔ عہدِ نبویؐ میں یہودیوں کو ان کی دشمنی، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مدینہ، خیبر اور فدک سے نکالا گیا تھا۔ اس اخراج کو وہ نہیں بھولے۔

صیہونیت ایک قومی و نسلی تحریک ہے اور اس کا ہدف عظیم تر اسرائیل ہے۔ اینگلوسیکسن گروپ کے تعاون سے وہ فلسطین پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ان کی آیندہ نسلیں اسی اتحاد کے ذریعہ عظیم تر اسرائیل حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔ اس وقت مشرق وسطیٰ میں جو کھیل کھیلا جارہا ہے اس کے انجام سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ بظاہر ان کے عزائم کی تکمیل میں کوئی بڑی رکاوٹیں نہیں لیکن مشیت خداوندی کے اپنے معاملات ہیں۔ قرآن مجید نے ان کی تاریخ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انھیں نکالا گیا تھا اور پھر واپسی کا سامان کیا گیا۔ دوبارہ نکالا گیا اور تیسری بار وہیں لوٹ کر آرہے ہیں۔ قیامت کی علامات میں جو کچھ احادیث و آثار میں آیا ہے اس کے مطابق یہودیوں کا سمٹ کر آنا، آخری تصادم کی تیاری ہے۔ جب پتھر بھی آواز دے گا کہ یہاں یہودی چھپا ہوا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں کی آزمایش کے لیے کیا باقی ہے؟

صیہونیوں نے اینگلوسیکسن گروپ کے اشتراک سے سیاسی و عسکری اور فکری و معاشی غلبے کے لیے جو منصوبہ بندی اور جو طریق کار اختیار کیا ہے، اس کے یہ چند پہلو قابل غور ہیں:

ان کے طریقہ کار میں پہلی چیز دشمن کے بارے میں پوری معلومات اکٹھی کرنا اور اس کی تہ تک پہنچنا ہے۔ اس کے لیے انھیں جو ذرائع بھی اختیار کرنا پڑیں وہ اختیار کرتے ہیں۔ علم، تجارت، ذاتی تعلقات اور رشوت و لالچ سے وہ مسلمان ملکوں، معاشروں اور حکومتوں کے اندر نفوذ حاصل کرتے ہیں۔ تاکہ ان کا کوئی پوشیدہ پہلو بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہ ہو۔

دوسری چیز یہ ہے کہ وہ قوموں کی تاریخ، ان کے عقائد، ان کی ثقافت اور ان کے فکر وعمل میں اختلاف و انتشار پیدا کرتے ہیں۔ قومی وحدت اور ملی یگانگت کو مجروح کرتے ہیں۔ قومیں جب انتشار کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے مقاصد کی تکمیل میں مدد و معاون بن جاتی ہیں۔ ہماری تاریخ میں عبداللہ بن سبا انتشار و الحاد کا نقطہ آغاز ہے۔ اسماعیلی، بہائی اور قادیانی اس عمل کی معروف علامات ہیں۔

تیسری چیز مسلمان معاشروں کو مغرب کی فکری اطاعت، عملی پیروی اور سیاسی کنٹرول میں دینا ہے۔ جو شخص ان سے اختلاف کرے گا اس کے لیے انھوں نے الزامات گھڑ رکھے ہیں: انتہا پسند، بنیاد پرست، دہشت گرد، تنگ نظر، رجعت پسند۔ ادھر اختلاف کی جرأت ہوئی، ادھر الزامات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ مسلمانوں کے اندر ان کے بالواسطہ اور بلاواسطہ گماشتے ان کا دیا ہوا فریضہ انجام دینے

میں مصروف ہیں۔

اس حوالے سے انھوں نے تین سبق پڑھانے اور انھیں معاشرے میں مسلمہ اصول قرار دینے کا عمل پوری قوت سے آگے بڑھایا ہے۔ ان مسلمات کی حیثیت عقیدہ کی ہے: سیکولرائزیشن (Secularization) ' ڈیموکریٹائزیشن (Democratization) ' کمرشلائزیشن (Commercialization)۔

i۔ سیکولرائزیشن: یہ وہ طریق کار ہے جس کے ذریعے پوری دنیا کو مغربی طرز فکر و عمل سے ہم آہنگ کرنا مطلوب ہے۔ یہودیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ غیر یہودی مذاہب ہیں۔ اس لیے ان کا اولین ہدف مذہبی تاثیر کو ختم کرنا ہے۔ اولین طور پر انھوں نے یورپ میں سیاسی و معاشی دائروں میں عیسائیت کو بے اثر کیا اور پھر پوری دنیا میں مذہب کے خلاف مہم چلائی۔ سیکولرائزیشن میں تین اہداف پیش نظر رکھے گئے۔

۱۔ مابعد الطبیعاتی ماخذ کی تحقیر کی گئی۔ چونکہ الہامی مذاہب کی بنیاد علم الٰہی ہے ' اس لیے اسے غیر عقلی اور غیر سائنسی نظریہ قرار دیا گیا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ دنیا ہی حقیقت ہے اس سے ماورا کوئی شے نہیں۔ ایک مرتبہ خدائی حوالے بے اعتبار ہو جائے تو ان کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

۲۔ مستقل اخلاقی اقدار کی نفی کی گئی اور یہ فیصلہ دیا گیا کہ انسانی زندگی میں ہر قدر کی حیثیت اضافی ہوتی ہے ' اور وقت کے ساتھ ساتھ اقدار بھی بدلتی جاتی ہیں۔ مذہب چونکہ اخلاقی قدروں کا نظام رکھتا ہے ' اس نظام اقدار پر تیشہ زنی سے مذہب کی گرفت از خود ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے بد اخلاق ' بے راہ رو اور آوارہ منش ہو جاتے ہیں۔ مغرب میں جنسی صنعت ' ذرائع ابلاغ اور تفریحی ادارے یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں۔ انھوں نے ترقی کے نام پر عریانی ' فحاشی اور بے راہ روی کو فروغ دیا ہے۔ امریکہ اور یورپ کی عیسائی سوسائٹی کی بنیادیں ہلا دینے میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ اور اس طرح کامیابی کے ساتھ مسلم دنیا میں بھی راہیں پیدا کرنے میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

۳۔ سیاست کو مذہبی اخلاقیات سے آزاد کرایا گیا۔ ریاست اور اس کے تمام ادارے مذہب و اخلاق سے لاتعلق کر دیے گئے۔ سیاست للِ ثروت کا کھیل ہے جس میں صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو ایک مضبوط مالی پوزیشن کے حامل ہیں۔ پارٹی سسٹم بھی ایک خاص نہج پر منظم ہے۔ مغربی ممالک کے پارٹی سسٹم کی تشکیل و تنظیم میں یہودی پوری طرح دخیل ہیں۔ سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کا نظریہ یورپ میں اپنا لیا گیا ہے اور مسلم دنیا میں اسے نافذ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

ان تینوں معیارات کے لحاظ سے مغربی معاشرہ ایک سیکولر معاشرہ ہے لیکن دلچسپ حقیقت یہ

ہے کہ یہودیوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا ہوا ہے۔ امریکہ و یورپ میں یہودیوں کے خلاف بات کرنا ایک امر محال ہے۔

ڈیمو کریٹائزیشن: جمہوری عمل بظاہر پرکشش ہے جس میں عوام کو آزادی دی جاتی ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ لیکن عملاً وہ رائے کا اظہار صرف ایک مرتبہ کرتے ہیں اور وہ بھی کسی دوسرے کو ووٹ دینے کی حد تک۔ اس کے بعد وہ حکومت کے رحم و کرم پر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انھیں یہ حق ہے کہ وہ مظاہرے کریں۔ دینی علم رکھنے والے دین کے حوالے سے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی بات کرتے ہیں جو جمہوریت میں عوامی اقتدار اعلیٰ کے نام نہاد نعرے سے ٹکراتی ہے اور مستقل نظام اقدار کا تحفظ کرتی ہے۔ اس لیے ان کا ہدف ہے کہ ان کو بے اثر کرنے کے لیے عامتہ الناس کی ایسی تنظیم کی جائے جو دینی حوالوں سے بات کرنے والوں کے مدمقابل کھڑی ہو۔ ان کی تحقیر کرے ' جمہوری عمل کے نام پر ایسی ہلڑ بازی اور دھونس جمائی جائے کہ شرفا کے لیے کوئی اقدام کرنا ناممکن ہو جائے۔ یہی وہ پالیسی ہے جس پر یہودی ایجنسیاں مصروف عمل ہیں۔ آج ہر مغربی حکومت اس ''جمہوری عمل'' کو تعلقات کے لیے اولیں شرط قرار دیتی ہے۔ اسلام کا شورائی نظام عوامی جمہوریت سے کہیں زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

کمرشلائزیشن: یہودیوں نے عمومی سطح پر آخرت کا تصور نکال دیا ہے۔ وہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے دنیا پرستی کے کئی فلسفے گھڑے ہیں۔ خدا کو بے دخل کرنے ' اخلاقی قدروں کو پامال کرنے اور دینی حوالوں کو بے اثر بنانے میں انھوں نے ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک ہر شے خریدنی و فروختنی ہے۔ مغربی دنیا میں سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کے پیچھے اصل جذبہ وسائل حیات پر کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ ایک وقت تھا جب اشتراکی فلسفے کے تحت نیشنلائزیشن منفعت بخش نعرہ تھا اور اب نج کاری عالمی نعرہ ہے۔ انھوں نے پوری دنیا کو مجبور کیا ہے کہ اپنے وسائل ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سامنے رکھ دیں۔ اس طرح مزدور ' طریق محنت ' وسائل پیداوار ' صنعت کاری و زراعت کی تنظیم و تنفیذ سب پر ان کا کنٹرول ہے یا ان کی ہدایات نافذ ہوتی ہیں۔ تمام بین الاقوامی ادارے ان کے زیر تصرف ہیں۔ عالمی مالیاتی فنڈ ' عالمی بنک ' تخفیف اسلحہ ' خاندانی منصوبہ بندی ' ماحولیاتی تحریکیں ' آزادی نسواں کی تحریکیں ' حقوق انسانی کی تنظیمیں ' ان کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔

اس طریق کار کے ذریعے انھوں نے مسلمان معاشروں میں راہیں پیدا کی ہیں اور اکثر جگہ انھیں غیر مستحکم ' منتشر بلکہ حواس باختہ کر دیا ہے۔ صیہونیوں کا مفاد اس میں ہے کہ مغربی ملکوں کی وحدت قائم ہو۔ امریکہ کی وحدت میں صیہونیوں کو اثر انداز ہونے کی آسانی تھی ' لیکن یورپ کے مختلف ملکوں

اور مختلف دارالحکومتوں کی وجہ سے دقتیں پیش آ رہی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے سارے یورپ کو متحد ہونے کا نعرہ دیا۔ یوں یورپ کو کنٹرول کرنا آسان ہو گا۔ امر واقعہ ہے کہ یورپ کی یک جائی کی اس تحریک کے پس پردہ واحد نظریاتی قوت یہودیت ہے۔

دوسری طرف ان کی پالیسی کا حصہ ہے کہ عالم اسلام مزید ٹکڑوں میں بٹے۔ صنعتی ترقی نہ ہو اور جو ترقیاتی منصوبے بنیں ان کی شہ رگ ان کے پنجے میں ہو' زراعت تباہ ہو' وسائل پر یورپ اور امریکہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قبضہ ہو۔ حکمران دست نگر ہوں۔ پالیسیاں مغربی ادارے تشکیل دیں۔ عالم اسلام ایک ہجوم اور ایک بھیڑ ہو جسے ہانکنے والے نام نہاد مقامی حکمران ہوں اور ہدایات دینے والے بین الاقوامی ادارے ہوں--- ہمارے ذمی حکمران اس خدمت کی بجا آوری کے لیے قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہودیوں کی اسلام دشمنی پر تو قرآن کریم گواہ ہے اور دشمن نے اپنی دشمنی کرنی ہی ہے۔ دشمن کو برا بھلا کہنے کے بجائے یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے فرض منصبی کو سمجھیں' اپنا مقام پہچانیں' اپنے فرائض انجام دیں اور مثبت اقدام کر کے دشمن کی چال کو ناکام بنا دیں ... لیکن افسوس کہ ہم صرف دشمن کو برا بھلا کہنے کو اصل کارنامہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہی اصل روگ ہے' جس نے مسلمان معاشروں کو بے عملی کا شکار اور تقدیر پرستی کے غلط مفہوم کا اسیر بنا دیا ہے۔ راست فکری و راست کاری بندۂ مومن کا فرض ہے۔ کیا ہم دشمن کی چالوں کی گنتی ہی کرتے رہیں گے' یا آگے بڑھ کر تعمیری انداز سے اس کا مداوا بھی کریں گے؟ یہ فریضہ صرف وہ اسلامی تحریکیں انجام دے سکتی ہیں' جو تجدید و احیائے دین کے شعور سے مالا مال اور عمل کے جذبے سے سرشار ہیں۔

خوش گوار روایت

گزشتہ ماہ ایک خوش گوار روایت کا آغاز ہوا۔ مدیر ترجمان کے اشارات ' اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش میں بنیادی اور فیصلہ کن مسئلہ: کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ جولائی میں ہی بھارت کے رسالہ زندگی نو (مدیر: فضل الرحمٰن فریدی) میں درج ذیل نوٹ کے ساتھ بھی شائع ہوئے۔ ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ زندگی نو اور ترجمان القرآن دونوں رسالوں میں یہ تحریر ایک ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ یہ ایک دردمند اور مضطرب دل کی آواز بھی ہے جس سے اگر عالمی ملت اسلامیہ اثر قبول کر سکے تو وہ مستقبل کا ایک ایسا دعوتی اور عملی منصوبہ بنا سکتی ہے جو دلوں کو مسخر کر سکے اور حقائق پر پڑی گرد دور کر سکے۔

کیا آپ اپنی آمدنی دوگنا کرنا چاہتے ہیں؟

یعنی ۱۰۰ فیصد اضافہ

آزمودہ نسخہ ہے:

آمدنی کا ۱۰ فیصد اللہ کی راہ میں بالالتزام انفاق کرنا شروع کر دیجیے

۱۰ گنا اجر سے آمدنی دوگنی ہو جائے گی

دوگنی ہی نہیں بلکہ اضعافا مضاعفہ

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے

ایک دانا بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں (البقرہ)

اللہ کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہے؟

ومن اصدق من اللہ قیلا

پس کون ہے جو اللہ کو سچا جانے اور دل اور جیب کھول کر آگے بڑھے' اپنے دانے

بوئے' اور وقت پڑنے پر لہلہاتی فصل کاٹے!!

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کا مقام کیا ہے' وہ یہ دیکھے کہ اللہ کا مقام' اس کے نزدیک کیا ہے۔ (حاکم)

حالات حاضرہ

ترکی میں نئے دور کا آغاز

مسلم سجاد

عام جمہوری روایات کے مطابق جو وزارت عظمیٰ رفاہ کے سربراہ نجم الدین اربکان کا آج سے ۶ ماہ پہلے حق تھی، بالآخر مسعود یلماز اور تانسو چلر کی مخلوط حکومت کی ناکامی کے بعد، ان کو مل گئی ہے۔ برطانوی دانش ور، Faith and Power کے مصنف ایڈورڈ مارٹیمر نے فنانشل ٹائمز (۱۲ جون ۹۶) میں لکھا کہ ''حساب کتاب کیا جائے تو یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اربکان حکومت بنائے اور ترکی کے معاشی بحران سنبھالنے کی ذمہ داری میں شرکت کرے، بجائے اس کے کہ اسے مزید حمایت ''تعمیر'' کرنے کی ''لگژری'' (luxury) کی اجازت دی جائے'' لیکن اس نے متنبہ کیا کہ ''اگر ترکی نے اپنا منہ مغرب کی طرف سے پھیرلیا تو پورے یورپ میں بہت زیادہ صدمہ (shock) ہوگا''۔ گذشتہ ماہ فلورنس میں یورپ کے سب بڑے جمع تھے۔ فرانس کے صدر شیراک نے مسعود یلماز کو کھانے پر الگ بلاکر، اپنی تنبیہہ پہنچائی کہ ہم ترکی میں دوسرا الجیریا یا ایران نہیں چاہتے۔ اسرائیل کا صدر ویزمین، استنبول میں ماحولیات کانفرنس میں شرکت کے لیے آتے ہوئے ہوائی جہاز میں ایک سوال کے جواب میں کہہ گزرا کہ ''میں نے ترکی آنے کی دعوت انھی معاملات کی خاطر قبول کی۔ میں سلیمان دیمرل کو اچھی طرح جانتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ اس طرح کی صورت حال کو روکنے کے لیے اس کے اختیار میں جو کچھ ہے، ضرور کرے گا''۔ ویزمین نے یہ بھی کہا کہ ''فوج بھی بیٹھی نہیں رہے گی''۔ یہ بیان ۱۱ جون کو ریڈیو اسرائیل سے عبرانی میں نشر ہوا۔ (ترکی پریس میں اس کی اشاعت پر شور مچ گیا۔ اسرائیلی سفارت خانے نے وضاحت جاری کی۔ اربکان کا تبصرہ تھا: میرے خیال میں ویزمین جہاندیدہ سیاستدان ہیں۔ انھیں معلوم ہوگا کہ انھیں ایسا بیان نہیں دینا چاہیے)۔

رفاہ (۱۵۹ ممبران) اور ٹرو پاتھ پارٹی (۱۲۹ ممبران) میں ۳۶ وزارتوں میں تعداد کے لحاظ سے برابر کی تقسیم، وزارتوں کی اہمیت کے حوالے سے نامنصفانہ محسوس ہوتی ہے۔ چلر نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ ہیں۔ تعلیم، داخلہ، دفاع، خارجہ اور مذہبی امور کی وزارتیں اور کئی اہم محکمے جونیئر پارٹنر کو ملے ہیں۔ جب کہ رفاہ کے حصے میں مالیات، انصاف، زراعت، ثقافت، توانائی اور لیبر جیسی وزارتیں

آئی ہیں ' سرکاری ٹیلی ویژن کا کنٹرول بھی (ترکی کے نظام میں وزارت عظمیٰ کا بجٹ باقی پوری حکومت کے بجٹ کے برابر ہوتا ہے) ۔ رفاہ کے حامیوں کے لیے یہ ایک ناخوشگوار صورت حال ہے ۔ رفاہ ' یلماز کو تقریباً یہی وزارتیں اور وزارت عظمیٰ کا پہلا دور دینے پر آمادہ تھی ۔ کیا وہ ہر قیمت پر اقتدار میں آنا چاہتے ہیں ؟ ان کا موقف ہے کہ ترکی کے مسائل حل کرنے کی ہماری بھی ذمہ داری ہے اور ہم اپنی یہ ذمہ داری ادا کرنا چاہتے ہیں ۔ پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور اب وزیر مملکت عبداللہ گل نے کہا: "ہماری طاقت کا راز 'اقتدار نہیں' خدمت ہے ۔ اور ہم نے خدمت والی وزارتیں ہی لی ہیں" ۔ یہ الزام بھی ہے کہ چلر کو کرپشن کے مقدمے سے بچایا گیا ہے ۔ رفاہ کے ایک ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ "چلر پر الزامات درست ہو سکتے ہیں لیکن اسے جیل بھیجنا میری پہلی ترجیح نہیں ' میری ترجیح تو اپنے عوام کی خدمت ہے" ۔ کیا بدنام سیاست دانوں سے اشتراک کر کے آپ کچھ بھلائی حاصل کر سکتے ہیں ؟ "بلدیات میں ہمارا تجربہ ہے کہ ایک دیانت دار ' باصلاحیت فرد بھی بہت فرق ڈال دیتا ہے" ۔

نئی حکومت کو غیر معمولی چیلنج درپیش ہیں ۔ معاشی بحران ' غیر معمولی افراط زر ' کرد مسئلہ ' نیز یہ کہ ترکی کے بیرونی مفادات کو اتنا الجھا دیا گیا ہے کہ سلجھانا آسان کام نہیں ۔ اسرائیل سے دفاعی معاہدے کے بارے میں سابق وزیر دفاع کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ نہ حکومت سے متعلق ہے ' نہ اسمبلی سے ' نہ وزارت دفاع سے ۔ یہ فوجی ہیڈ کوارٹر کا معاملہ ہے اور وہاں بھی چند مقتدر جرنیلوں کا ۔ اس وقت کے وزیر اعظم مسعود یلماز نے بھی اس معاہدے کے ترکی کے مفاد میں ہونے کے بارے میں اپنے شبہات کا اظہار کیا تھا ۔

اربکان صورت حال بہتر کرنے کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں ۔ انہوں نے پریس کانفرنس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا تو مغربی میڈیا نے اس کا بھی نوٹس لیا ۔ انہوں نے مسلم دنیا سے تعلقات بڑھانے پر زور دیا ہے ۔ وہ قازقستان سے مراکش تک اسلامی بلاک کے علمبردار ہیں ۔ امریکہ کے انڈر سیکرٹری آف اسٹیٹ پیٹرٹرن آف سے جو حالات کا جائزہ لینے انقرہ آئے تھے انہوں نے ۴ جولائی کو صاف کہا کہ امن کی خاطر اسرائیل کو جولان کی پہاڑیوں سمیت ان سب علاقوں کو خالی کر دینا چاہیے جو اس نے حملہ کر کے قبضہ کیے ہیں ۔ داخلی محاذ پر تنخواہوں میں ۵۰٪ اضافہ کے جو اثرات ہوں گے اس کا اندازہ ہم بھی کر سکتے ہیں ۔

اربکان نہ مصدق ہیں ' نہ ناصر اور نہ ہی خمینی ۔ انھیں ایک عملی صورت حال سے سابقہ ہے ۔ ان کا یہ وعدہ ہے کہ اب حکومت یہ یقینی بنائے گی کہ کوئی اقدام ترکی کے مفادات کی قیمت پر نہ کیا جائے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب اور اسلام کا تنازعہ دونوں کے مفاد میں نہیں ہے ۔ معلوم نہیں مغرب میں کتنے لوگ یہ سمجھتے ہیں ۔ وہ اکتوبر ۹۴ میں امریکہ کے دورے پر گئے تو کہا کہ گزشتہ ۵۰ سال سے ترکی

نے صرف قرض لیا ہے' ایک پیسہ بھی واپس نہیں کیا ہے۔ رفاہ اقتدار میں آئے گی تو مختصر مدت میں پائی پائی ادا کر دے گی' اس لیے کہ ہم معیشت بحال کر دیں گے۔ پھر ہمارے تجارتی تعلقات نئی بلندیوں کو چھوئیں گے۔ ایک امریکی سفارت کار نے ان سے ملاقات کے بعد کہا' اربکان بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ اس لیے کہ وہ نہایت ذہین ہے۔

۷۰ سالہ حوجہ (مذہبی اور مقدس فرد)' انجینئر' ڈاکٹر' پروفیسر اور اب وزیراعظم اربکان ایک قاضی کے بیٹے ہیں۔ ۱۹۴۸ میں انجینئرنگ کی ڈگری لی' ۱۹۵۱ میں ترکی سے پہلا اور ۱۹۵۳ میں جرمنی سے دوسرا پی ایچ ڈی کیا۔ استنبول کی ٹیکنیکل یونیورسٹی کے ہوسٹل میں وہ اپنے کمرے میں جماعت کراتے تھے۔ یہ اس دور میں نہایت غیر معمولی بات تھی۔ اکثر تین چار افراد ہی ہوتے تھے۔ ان میں ایک طالب علم سلیمان دیمرل بھی ہوتا تھا۔ اربکان نے مختلف عہدوں پر کام کیا اور جہاں بھی کام کیا ہے' اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ سیاست میں آئے تو آگے ہی بڑھتے گئے' ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کیا اور راستہ نکالا۔ ۱۹۷۴ میں جب وہ نائب وزیراعظم بنے تو وزیراعظم کی غیر حاضری میں ان کے فیصلے کی رو سے ترک افواج نے قبرص پر حملہ کیا اور وہاں ترکوں کو نسلی صفائی سے بچایا اور آج وہ امن و سلامتی سے شمالی قبرص کی ترک جمہوریہ میں رہتے ہیں۔ انھیں بنیاد پرست قرار دے کر وزیراعظم بننے سے روکنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اسلام دشمنوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بنیاد پرست نہیں ہیں! وہ ماڈرن' اور خطرناک حد تک معتدل ہیں۔

رفاہ کی کامیابی کا راز دیانت اور مستعدی ہے۔ جو بلدیات انھوں نے سنبھالی ہیں وہاں تبدیلی ہر ایک کو نظر آتی ہے۔ ایک ہی سال میں استنبول کارپوریشن کی آمدنی میں ۸۰۰ فی صد اضافہ ہوا۔ ان کے زیر انتظام بلدیات میں شہریوں کو سستی روٹی اور صاف پانی مل رہا ہے' سڑکیں اور گلیاں صاف ستھری رہتی ہیں' پبلک ٹرانسپورٹ با آسانی سب کو ملتی ہے' دفتروں میں سب کام رشوت کے بغیر تیزی سے ہو رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کی خدمت کریں گے اور لوگ شراب خانوں اور نائٹ کلبوں کا علاج خود کر لیں گے جو اس وقت صحت مند جسم پر پھوڑے پھنسیوں کی طرح ہیں۔

اربکان اور رفاہ پارٹی کے اب تک کے ریکارڈ کی بنیاد پر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ موجودہ چیلنج کا کامیابی سے مقابلہ کر کے امت مسلمہ کے درخشاں مستقبل کا راستہ کھولیں گے۔ کمالی دور میں اور اس کے بعد ترک قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے' اس کے باوجود رفاہ کی مسلسل بڑھتی ہوئی مقبولیت (قومی انتخابات میں ۲۱.۵ فی صد کے بعد حالیہ ۴۱ ضلعوں کے بلدیاتی انتخابات میں ۳۳.۵ فی صد ووٹ۔ ان کو قومی سطح پر منتقل کیا جائے تو آئندہ اسمبلی میں مطلق اکثریت حاصل ہوتی ہے) اس بات کا ثبوت ہے کہ ترک قوم کے اجتماعی ضمیر سے ان کی اسلامیت کو کھرچا نہیں جا سکا ہے۔ رفاہ کی کامیابی میں خواتین کا غیر

معمولی کردار ہے۔ جب اربکان ان کو ماضی رفتہ کی یاد دلاتے ہیں تو وہ اپنے سنہرے مستقبل کی تعمیر کے لیے ان کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ یقیناً راستہ دشوار ہے' قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں' اقتدار دیا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ ناکام ہوں' ناکام کرنے کی ہر تدبیر کی جائے گی' لیکن مسلمانوں کی عزت اور وقار اور موجودہ دور مظلومیت کے اختتام کا خواب دیکھنے والوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ اگر آج جمہوریت کا نام جپنے والے اور مسلمانوں پر جمہوریت دشمنی کا الزام لگانے والے مغربی حکمراں' مسلمان ملکوں کو جمہوریت کی راہ پر آگے بڑھنے کی "اجازت" دے دیں تو افغانستان' الجیریا' مصر' مراکش' تیونس' انڈونیشیا اور پاکستان جن کا جسم اپنوں کے لگائے ہوئے زخموں سے لہولہان ہے' ۲۱ ویں صدی میں پر امن' خوش حال' مستحکم' باوقار' آزاد جمہوری ملک کی حیثیت سے داخل ہوں گے جہاں عوام کی خواہشوں اور آرزوؤں کے مطابق ان کے دین کی فرماں روائی ہوگی' اقلیت کے دور استبداد کا خاتمہ ہوگا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ بنیاد پرستی کے الزام لگا لگا کر اور عراق' ایران' سوڈان اور لیبیا پر پابندیاں لگا لگا کر' اس رو کو روکا نہیں جا سکتا جو غالب ہونے کے لیے چلی ہے۔ وزیراعظم نجم الدین اربکان' وزیراعظم گلبدین حکمت یار کے بعد معلوم نہیں ابھی کتنے ایسے نام اور ہوں گے جو دنیا کے ہر حصے کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں' وہ آئیں گے اور ان مسلط ناموں سے نجات ملے گی جن کے لیے دلوں میں نفرت اور غضب کے سوا کچھ نہیں۔

آج دنیا کی نظریں ترکی پر لگی ہیں' مغرب اندیشوں میں مبتلا ہے' اسلامی دنیا امید و بیم کی نظروں سے دیکھ رہی ہے' مسلمان ملکوں کے ناجائز مسلط حکمرانوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔ ایک غیر معمولی تجربہ کا آغاز ہوا ہے۔ انقلابی اصلاحات کے وعدے نہیں' صرف دیانت دار' خادم اور مستعد حکومت کو عوام نے اپنے اعتماد سے نوازا ہے۔ ترکی دستور کی پابندیاں اپنی جگہ' رفاہ کی حقیقت اور پروگرام واضح اور آشکار ہے۔ رفاہ کے قائد کے لیے چیلنج یہی ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کی تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر اپنے منصب کی اہمیت کو محسوس کریں اور ایسی کارکردگی سامنے لائیں کہ دشمن کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں اور جلد ہی وہ نئی صبح طلوع ہو جس میں ترکی ماضی کی طرح پھر عالم اسلام کی قیادت کرے۔

ماخوذ از:

M H Faruqi, Refah breaks the Curfew, no radical solutions, just better government, IMPACT international, vol 26 No 7 July 1996

نیتن یاہو کی کامیابی اور عرب ممالک

عبد الغفار عزیز

نو منتخب صیہونی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو نے پارلیمنٹ میں جو پالیسی بیان دیا ہے' وہ چار "نہیں" (Noes) پر مشتمل ہے۔ القدس کی تقسیم ......؟ نہیں۔ جولان کی پہاڑیوں سے دست برداری .....؟ نہیں۔ مزید یہودی بستیوں کی تعمیر روکنا ....؟ نہیں۔ کسی مستقل فلسطینی مملکت کا قیام .....؟ نہیں۔

یاسر عرفات کے ساتھ مذاکرات کے سوال پر یہ موقف پیش کیا گیا ہے کہ "کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے مذاکرات کیے جاسکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے وعدوں پر مکمل عمل درآمد کرے" یعنی حماس اور دوسرے جہادی گروپوں کو مکمل طور پر کچل دے۔ "حکومت اپنا یہ حق محفوظ رکھتی ہے کہ وہ دہشت گردی کو کچلنے کے لیے جس وقت اور جہاں ضرورت پڑے فوج اور دوسری سیکورٹی فورسز کو استعمال کرے"۔ پروگرام میں کہا گیا ہے کہ "حکومت شمال اسرائیل (یعنی جنوبی لبنان میں) اسرائیلی باشندوں کے تحفظ کی خاطر اور ان باشندوں کو درپیش خطرات کے ازالے کی خاطر تمام ممکنہ کارروائیاں کرے گی"۔ ایک دوسری شق میں کہا گیا ہے کہ "جولان کی پہاڑیوں کی اسرائیلی دفاع کے لیے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے شام کے ساتھ کسی بھی بات چیت سے پہلے اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ جولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی اقتدار برقرار رہے"۔ شق میں دیگر مقبوضہ علاقوں پر اپنے قبضے کو باقی رکھنے کا اعلان یوں کیا گیا ہے..... "حکومت سمجھتی ہے کہ جولان' وادی اردن' یہودا و سامرہ (دریائے اردن کی مغربی پٹی کا عبرانی نام) اور غزہ (وہی غزہ جہاں یاسر عرفات کو خود مختاری کا سراب دکھایا جارہا ہے) میں مزید یہودی بستیوں کی تعمیر عظیم قومی فریضہ ہے"۔

نئی حکومت کے پروگرام کی ان جھلکیوں سے صاف ظاہر ہے کہ کس طرح ایک طرف تو "دہشت

گردوں" یعنی مجاہدین کو کچلنے کی دھمکی دی جا رہی ہے' تمام پڑوسی ممالک کے خلاف اعلان جنگ کیا جا رہا ہے' یاسر عرفات کو اس کی اصل حیثیت کا احساس دلایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ لالچ اور شہ بھی دی جا رہی ہے کہ وہ حماس اور جہاد اسلامی جیسی تنظیموں کو کچلنے کے لیے جتنا موثر کردار ادا کرے گا' ہم اتنا ہی اس کے خلوص و وفاداری کے قائل ہوں گے۔

یاہو کی طرف سے اس کھلے اعلان جنگ' اس کے وزرا کی طرف سے عربوں کی کھلم کھلا تذلیل (عرب کیڑے مکوڑے ہیں) اور الیکشن میں اپنی ساری شرطیں پیریز کے ناکام گھوڑے پر لگا دینے کی وجہ سے بعض عرب ممالک میں تشویش کی شدید لہر دوڑ گئی۔ مصر' شام' اردن اور سعودی عرب نے اس تشویش کے عملی اظہار کے لیے عرب سربراہی اجلاس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۹۰ کے بعد سے اب تک عالم عرب اور عالم اسلام میں متعدد اہم تبدیلیاں اور خطرات سامنے آئے' الجزائر میں جمہوریت کا خون ہوا اور پھر طویل خانہ جنگی شروع ہو گئی' سوڈان کا ناطقہ بند کر دینے کی سازشیں ہوئیں' لیبیا کے خلاف ایٹم بم تک استعمال کر دینے کی دھمکی دی گئی' بحرین کے فسادات گھمبیر تر صورت اختیار کر گئے' یمن اور سعودی عرب کے اختلافات جنگ تک پہنچ گئے' یمن اور اریٹریا کے درمیان جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی' صومالیہ کا ناسور نیند یں حرام کر گیا' بوسنیا اور چیچنیا میں تاریخ کے سفاک ترین مظالم ہوئے لیکن کوئی سربراہی کانفرنس ناگزیر نہ ہوئی۔ ناگزیر ہوئی تو اس وقت جب عرب اسرائیل محبتوں کا سفر خطرے میں پڑتا دکھائی دیا۔

چھ برس کے طویل انقطاع کے بعد ۲۲ جون کو عرب سربراہی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ اگرچہ بہت تاخیر سے ہوا لیکن درست ہوا کیونکہ مسلمان ممالک کے مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ سب ذمہ داران باہم مل بیٹھیں اور امت مسلمہ کے مفاد میں باہم مذاکرات اور تعاون کے ذریعے انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ عرب سربراہوں کی کانفرنس سے یہ 'امید' تو نہیں تھی کہ وہ امت مسلمہ کے مفاد میں فیصلے کریں گے لیکن بہرحال ان کا مل بیٹھنا ہی ایک نیک فال تھا۔ اسی لیے اخوان المسلمون مصر نے اس کا خیر مقدم کیا۔

جیسے ہی اس کانفرنس کا اعلان ہوا امریکہ نے اسے روکنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ وہ مصر جو پوری دنیا میں اسرائیل کے بعد امریکہ کا سب سے زیادہ وفادار آلہ کار ہے' اس کو دھمکی دی گئی کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ہم تمھارے خلاف بھی اسی طرح پابندیاں لگا دیں گے جس طرح ہم (تمھیں استعمال کر کے) سوڈان اور دیگر ممالک پر لگا چکے ہیں۔ کانفرنس شروع ہونے سے پچھ دن قبل واشنگٹن میں امریکی ترجمان نے صحافیوں کو یہ "انتہائی تشویش ناک" اطلاع دی کہ ڈیڑھ ماہ قبل مصر نے کوریا سے جو ڈیڑھ سو سکڈ میزائل حاصل کیے ہیں وہ علاقے کی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ

ہیں۔ اور اگر مصر باز نہ آیا تو امریکہ کو مصر کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ امریکہ اپنے مفادات کے علاوہ کسی کا وفادار نہیں ہے۔ مصر جیسا ملک اور حسنی مبارک جیسے حکمراں جو آقائے ولی نعمت امریکہ کی خاطر اپنے عوام کے لیے جلا دصفت بنے ہوئے ہیں' وہ اگر ذرا بھی لائن سے ہٹتے ہیں' آنکھیں دکھانے کا تو تصور نہیں کر سکتے' تو ان پر بھی پابندیوں کی تلوار لٹکا دی جاتی ہے۔

عرب سربراہ کانفرنس میں منظور ہونے والی قرار دادوں میں ایک بار پھر وہی زبان استعمال کی گئی جو اوسلو مذاکرات شروع ہونے سے پہلے عرب ممالک استعمال کیا کرتے تھے' فلسطینیوں کی (آزادی نہیں) خود مختاری اور حقوق کی بات' جولان کو آزاد کر دینے کی درخواست' جنوبی لبنان' شام اور اردن کے ساتھ گفت و شنید پہ اصرار۔ اس طرح یہودی انتظامیہ کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر تم اپنا لہجہ (نہ کہ پالیسی) نہیں بدلو گے تو ہم پورے عرب ممالک کو یک جا کر کے تمہارے خلاف قرار دادیں پاس کر سکتے ہیں۔ یاہو نے اس کانفرنس کا کیا اثر قبول کیا.....؟ اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ اور اس طرح کی عرب کانفرنسیں ہم پر کیا اثر انداز ہو سکتی ہیں! ان کی باتیں ہوائیں اور الفاظ کی سیاہی کاغذوں پہ رہ جائے گی"۔

تحریک مزاحمت اسلامی حماس کا موقف اس ساری صورت حال میں بے حد واضح اور دو ٹوک رہا ہے۔ صیہونی انتخابات کے فوراً بعد حماس نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ اگرچہ یاہو کے آنے پر بہت شور مچایا جا رہا ہے لیکن حقیقت میں فلسطینیوں کو ان چہروں کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کی مصیبتیں اسی طرح باقی رہیں گی اور یاہو بھی وہی پروگرام نافذ کرے گا جو پیریز نافذ کر رہا تھا۔ پیریز اور یاہو میں فرق صرف اتنا ہے کہ پیریز اعتدال پسندی' مذاکرات' بات چیت اور عرفات کے ساتھ افہام و تفہیم کا نقاب اوڑھ کر فلسطینیوں پر ظلم ڈھا رہا تھا اور یاہو کسی نقاب کے بغیر اور اپنے اصل چہرے کے ساتھ وہی ظلم ڈھائے گا۔ اعتدال پسندی کے دعوے دار پیریز نے اپنے دور حکومت میں لیکوڈ پارٹی کے سابقہ سربراہ شامیر کی نسبت دوگنی سے بھی زیادہ رقم یہودی بستیوں کی تعمیر پر صرف کی تھی۔ حماس کا یہ موقف ہے اور تمام مسلم ممالک سے اس کا یہ مطالبہ بھی' کہ اب جب کہ امریکہ اور اسرائیل نے مذاکرات اور امن معاہدے کا ڈھونگ اپنے ہی تعصب آمیز رویے اور آیندہ امریکی انتخابات میں صیہونی ووٹوں کے لالچ کی نذر کر دیا ہے تو عرب اور مسلم حکمرانوں کو بھی اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی صفوں کو متحد اور اپنے عوام کو آزادی قدس کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ عرب حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عرب حصار سے باہر نکلیں اور امت کے ساتھ شامل ہو کر طاقت و قوت حاصل کریں۔ امت کی طاقت کا اصل راز اپنے ایمان سے مضبوط رشتہ اور باہمی اتحاد ہے۔ یہ ہو تو کسی روس

کو چیچنیا میں 'کسی سربیا کو بوسنیا میں 'کسی بھارت کو کشمیر اور خود بھارت میں 'مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہ ہو۔ فلسطین کے مسئلہ کا حل بھی اسی نسخہ میں ہے۔ پچاس سال سے امریکہ کے آگے ناک رگڑنے سے کیا ملا ہے؟ رب کائنات سے جڑ کر 'ملت واحدہ بن کر بھی دیکھیں۔ عرب ممالک کی کانفرنس کا نقطہ آغاز ثابت ہو' اب بھی آنکھیں کھل جائیں تو امت مسلمہ کے درخشاں مستقبل کے لیے اس سے زیادہ خوشگوار علامت اور کیا ہو سکتی ہے۔

سعودی عرب میں بم دھماکہ

مسلم سجاد

۲۶ جون کو سعودی عرب کے شہر الخبر کے کنگ عبدالعزیز ایربیس کے بم دھماکہ میں ۲۳ امریکی فوجی ہلاک اور سیکڑوں زخمی ہوگئے۔ سعودی عرب میں گذشتہ سات ماہ میں یہ دوسرا بم دھماکہ تھا۔ پہلا بم دھماکہ جو سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ہوا تھا اس میں ۵ امریکی فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ اس بم دھماکہ کے الزام میں جن افراد کو گرفتار کیا گیا تھا ان کے سر بر سرعام قلم کر دیے گئے ہیں۔

سعودی عرب جیسے پرامن 'جنگ و جدال' ہنگامہ آرائی اور دہشت گردی سے پاک ملک میں صرف سات ماہ کے عرصے میں دو بار امریکی شہریوں کو نشانہ بنانے کی ان کارروائیوں کو بنیاد پرستوں کی دہشت گردی کہہ کر اصل مسئلہ سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

کویت اور عراق کے درمیان تنازعہ کو بھڑکا کر امریکہ نے اقوام متحدہ اور اپنے حلیف مغربی ممالک کی مدد سے اس خطہ میں اپنے قدم جس طرح جمائے ہیں اس نے اسلام اور عالم اسلام کے ہر خیرخواہ کو پریشان کر دیا ہے۔ خلیج کی جنگ میں بظاہر کویت اور دیگر ممالک کا نجات دہندہ بن کر امریکہ نے نہ صرف اپنی لڑکھڑاتی ہوئی معیشت کو سنبھالا بلکہ اپنے ناکارہ اسلحہ کو بھی لاکھوں ڈالر کے عوض سعودی عرب اور کویت کے ہاتھ بیچ کر ٹھکانے لگا دیا۔ ساتھ ہی اس خطہ کا پولیس مین بن کر ہزاروں کی تعداد میں اپنی افواج کو کویت 'سعودی عرب کے ساتھ ساتھ خلیج میں اتار دیا۔ مقصد نام نہاد عراقی جارحیت کو روکنے کے بہانے امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کا تحفظ تھا۔ اب بھی صرف سعودی عرب میں ۳۵ ہزار فوجی اور فضائیہ کا ونگ ۴۴۰' ۳ ہزار عملہ کے ساتھ بروقت موجود ہے۔

۹۱ - ۱۹۹۰ سے امریکہ و دیگر ممالک کی افواج کا سارا بوجھ سعودی عرب اور خلیج کے دیگر عرب ممالک کے حصہ میں آیا ہے۔ نتیجتاً" وہ ملک جو تیل کی دولت سے مالا مال تھا' آج اس کا اپنا بجٹ بھی

خسارے کا شکار ہے۔

معیشت کی تباہی کے ساتھ ساتھ امریکی افواج میں خواتین کی موجودگی' عریانی اور مغربی تہذیب کے بے محابا مظاہرے' نیز سعودی ٹی وی پر امریکی پروگرام' وہ دیگر اسباب ہیں جس نے سعودی عرب کے علما اور اسلام کا درد رکھنے والوں میں بے چینی و اضطراب پیدا کر دیا۔ سعودی عرب کے انتظامی معاملات میں امریکی مداخلت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ موجودہ واقعہ کے بہانے امریکہ نے اپنی انٹیلی جینس کی پوری بٹالین سعودی عرب میں اتار دی۔ شاہ فہد کے بعد سعودی عرب کا حکمران کون ہو' یا شاہ فہد کی علالت کے دوران ملک کا انتظام و انصرام کون سنبھالے' یہ بھی امریکی منشا کے خلاف طے نہیں ہو سکتا۔ اس خطہ میں امریکی تسلط نے اسرائیل کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے نیز عربوں کو قابو میں کرنے کا پورا موقع فراہم کر دیا ہے۔ جو اسرائیل سینے میں خنجر کی طرح کھٹکتا تھا' اب اس سے پینگیں بڑھانے کی صرف باتیں ہی نہیں ہو رہی ہیں بلکہ یہودیوں سے تجارتی و دیگر تعلقات استوار کرنے کے لیے شرعی جواز بھی تلاش کیے جا رہے ہیں۔

سعودی عرب کو مقامات مقدسہ اور تاریخی پس منظر کی وجہ سے مسلمانوں میں جو منفرد مقام حاصل ہے' اس کی بنا پر عالم اسلام کے مسلمانوں کا امریکہ کی اس خطے میں موجودگی پر تشویش میں مبتلا ہونا ایک فطری امر ہے۔

اس تشویش ناک صورت حال پر سعودی عرب کے علما اور دینی طبقے میں ۹۱ - ۱۹۹۰ سے ایک لاوا پک رہا تھا۔ پہلے دبے دبے لفظوں میں علما نے اس پر آواز اٹھائی لیکن جب حکومت کے کان پر جوں نہیں رینگی تو جمعہ کے خطابات کے ذریعہ عوام الناس کو پیش آمدہ خطرات سے آگاہ کیا گیا۔ لیکن حکمرانوں نے علما و صلحا کی بات کو تسلیم کرنے کے بجائے انھیں جیلوں میں ٹھونس دیا۔ بیشتر کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کر دیا گیا۔ کئی لوگوں کو ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں پناہ لینی پڑی۔

امریکہ' مغرب اور اس کے زیر تسلط میڈیا اس کارروائی کو دہشت گردی کا نام دے رہا ہے۔ جو اس سرزمین سے عقیدت رکھتے ہیں' یہ ان کے لیے ایک غور طلب امر ہے کہ جب حکمرانوں کو ان کے غلط اقدام سے باز رکھنے کے لیے پرامن اور جمہوری تمام ذرائع ختم ہو جائیں اور حق گوئی جرم قرار پائے تو اہل ایمان کے پاس اس خطرے سے اسلام اور عالم اسلام کو بچانے کا اور کون سا طریقہ باقی رہ جاتا ہے؟ اب بھی وقت ہے کہ سعودی عرب کے حکمران اپنی رعایا کے غم و غصہ' اضطراب و بے چینی کو کسی سیل رواں میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی اصلاح حال کی تدابیر کر لیں۔

سابقہ تجربوں کی روشنی میں یہ بات امریکہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ عوام کی خواہش کے علی الرغم وہ کسی بھی سرزمین پر اپنا جبری تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ویت نام' ایران اور صومالیہ دور کی

بات نہیں ہیں ۔ اس وقت امریکہ کے خلاف مسلمانوں کا غم و غصہ چھوٹی موٹی کارروائیوں تک محدود ہے ' لیکن اگر اس نے اس خطے میں اپنے مذموم مقاصد بروئے کار لانے کی کوشش کی تو پھر وہ پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کو اپنے خلاف صف آرا پائے گا ۔

خدا سعودی حکمرانوں کو حکمت و تدبر سے نوازے اور یہ سرزمین ہر قسم کی ہنگامہ آرائیوں اور فتنہ و فساد سے محفوظ رہے ۔

63

بحث و نظر

تحریکِ اسلامی کا آیندہ مرحلہ

ڈاکٹر عبد المغنی

عصرِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی فکر انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہوئی۔ یہ دور یا تو سامراجی نو آبادیات کا زمانہ تھا یا اس کے خاتمے کے فوراً بعد کا۔ یہی دور بہرحال ایک ایسے عالمی تمدنی انقلاب کا زمانہ بھی ہے جو ابھی تک نہ صرف جاری ہے' بلکہ اس کی پیچیدگیاں اور ہنگامہ آرائیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ ایک طرف تکنیکی ترقی زمین کی تہوں سے آسمان کی وسعتوں تک پہنچ رہی ہے' تو دوسری طرف نفسیاتی الجھنیں اور اخلاقی بیماریاں انسان کو حیوان بنا رہی ہیں طاقت اور عیش کے سامان حد سے زیادہ بڑھ رہے ہیں' مگر دل و دماغ کی بے چینی و بے اطمینانی بھی اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ سائنس اور صنعت کے گہوارے میں پلی ہوئی سیاست و معیشت پورے سماج پر چھائی ہوئی ہے۔

عصرِ حاضر کے فکری انتشار اور عملی بحران نے اسلامی احیا کے علم برداروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ کچھ لوگ جمود کا شکار ہو گئے' کچھ تذبذب کا' اور بعض شدت پسندی کا۔ اس تشویش انگیز صورت حال کا ایک اندازہ سیاست وقت میں اسلامی عناصر کی ان ناکامیوں سے لگایا جاسکتا ہے جو مشرق وسطی سے جنوبی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بعض جگہ تحریک کے علم بردار ست رو ہیں' تو بعض جگہ عجلت پسند۔ بعض جگہ وہ عدم تدبر کے سبب غلط حکمت عملی بھی اختیار کر رہے ہیں۔ بعض جگہ ایک قسم کی سیاست زدگی کے سبب اصلاح معاشرہ کے لیے تربیت شعور اور تعمیر کردار کی مہم کو نقصان پہنچ رہا ہے' جو تحریک کا اصل مقصود و مطلوب ہے۔

سوال یہ ہے کہ عصر حاضر میں تحریک اسلامی کا آیندہ مرحلہ کیا ہے؟ تحریک اسلامی کو عالمی سطح پر جس پیہم بگڑتے ہوئے ماحول سے سابقہ درپیش ہے آج اس کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل نکات دریافت ہوں گے۔

۱۔ نقل و حمل' نشرو اشاعت اور گفت و شنید کے برق رفتار وسائل نے دنیا کے مختلف ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ جو واقعہ ایک جگہ ہوتا ہے اس کا اثر دوسری جگہ بھی فوراً پڑتا

ہے۔ اس لحاظ سے رجحانات و میلانات نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سیاست اور تجارت کے تقاضے بھی ملکوں اور قوموں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رہے ہیں' جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے پہلے ہی فکر و عمل کی سرحدیں توڑ دی ہیں۔ امریکہ نئے عالمی نظام کی صدا بلند کر رہا ہے۔

۲۔ یہ نظام نو در حقیقت پرانا مغربی طرز حیات ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک مشرق کے پس ماندہ نیز ترقی پذیر ممالک کو ایک نئی اور بدتر ذہنی غلامی کا پیغام دے رہے ہیں۔ گویا ایک نئی سامراجی نو آبادیات کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں۔

۳۔ نری مادہ پرستی اور غیر متوازن مادی ثروت نے مغرب میں ایک شدید روحانی افلاس پیدا کر دیا ہے حتیٰ کہ مشرق کے بعض خطوں کے جوگی بھی یورپ اور امریکہ کے دولت مندوں کو روحانی تسکین کے نام پر کھلی ہوئی جنسی بے راہ روی اور کج روی میں مبتلا کر رہے ہیں۔

۴۔ انسان کا یہ نفسیاتی زوال و انتشار عصر حاضر کا سب سے پرخطر اور تباہ کن مسئلہ ہے۔ مسلم ممالک اور بعض جگہوں پر احیائے اسلام کے علم بردار بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ آئینی و جمہوری طور پر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے بجائے تشدد کی واردات متعدد مقامات پر زندگی کو جہنم بنا رہی ہیں۔ یہ چیز صبر و تحمل کی کمی' حقیقت پسندی کے فقدان اور غلط اندازوں کے سبب ہو رہا ہے۔

۵۔ ان آفاقی حالات میں سب کچھ بے معنی ہے' تاوقتیکہ علوم و فنون کی پیش قدمیوں اور آلات و وسائل کی فراوانی کو صحیح رخ دے کر مفید تعمیری کاموں میں نہ لگا دیا جائے۔ اس کے لیے آج کی برق رفتار زندگی کے ہر دائرے میں مہارت کی ضرورت ہے' لیکن یہ مہارت بھی اسی وقت کار آمد ہو سکتی ہے جب بصیرت ایمانی زمانے کی رفتار کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کی جہت کو درست کرنے کی ذہنی و عملی قوت کا ثبوت دے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی پیچیدگی کو ایک معتدل قسم کی سادگی میں تبدیل کرنا پڑتا ہے لیکن یہ مہم سادگی سے انجام نہیں دی جا سکتی' اس کے لیے بڑی پرکاری کی ضرورت ہے۔ حالات کی گرہیں روشن دماغوں کی انگلیاں ہی کھول سکتی ہیں۔

تحریک اسلامی کے آیندہ مرحلے کا تناظر یہی ہے۔ اب اس مرحلے کا نقشہ کار مرتب کرنے کے لیے مندرجہ ذیل خطوط پر کام کرنا چاہیے۔

اول: جدید انسان کو ایک بہتر آفاقی متبادل کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سرمایہ داری' ملوکیت' اشتراکیت اور لادین جمہوریت کا پول اچھی طرح کھول کر' ایک بدرجہا بہتر نظریہ زندگی اور نظام حیات کی حیثیت سے اسلام کی تعلیمات واضح کر دی ہیں۔ انھوں نے عصر حاضر کی تحریک اسلامی کا تنظیمی طریق کار بھی نہ صرف متعین کر دیا' بلکہ اس کے مطابق کام کرنے کے لیے قیادت کا نمونہ عمل بھی پیش کر دیا۔ ان کے تدبر اور تدبیر کے اثرات بھی عصر حاضر میں اسلام کے صحیح تعارف

کی حد تک اہل نظر کے سامنے آگئے۔ لیکن نمونے کا سماج اور نمونے کی ریاست کا قیام نہیں ہو سکا، جس کے سبب مولانا کا فکری لٹریچر، عملی تبلیغ کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکا۔

دوم: اقبال اور مولانا مودودی دونوں نے اپنے زمانے اور مستقبل کی حقیقتوں کو جس ہمہ گیر بصیرت کے ساتھ سمجھا اور انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے فکر و عمل کا جو وسیع البنیاد خاکہ مرتب کیا تھا اس کا شعور آج کے اسلامی دانش وروں کے درمیان عام نہیں ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قائدانہ وسعت نظر اور استقامت کردار دونوں کا فقدان ہے۔ تحریک اسلامی کے کئی دھارے بالعموم یا تو خانقاہی تصوف کے رویے کی طرف مائل ہو چکے ہیں، یا خرابی احوال سے متاثر ہو کر سیاست زدہ ہیں۔ اس لیے تحریک اسلامی کو جلد سے جلد اس کے بنیادی و کلی موقف اور رخ پر لانا ہو گا۔ اس سلسلے میں نہ تو دین کی نئی تعبیر کی ضرورت ہے، نہ شریعت میں اجتہادی، جب کہ اس تعبیر و اجتہاد کی اہلیت بھی بروقت نایاب ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مولانا مودودی نے اسلامی نظریے کا اطلاق جس طریقے سے حالات و مسائل پر کرنے کی کوشش کی، جس انداز سے وہ تحریک اسلامی کو سیاست وقت میں لائے، اس کا گہرا مطالعہ ان کے بیانات و اقدامات کی روشنی میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ مولانا کے انداز فکر اور طریق کار کا موازنہ اجتماعی امور میں مشرق وسطی یا عالم عرب کی اسلامی تحریک کے علم برداروں کے رویے اور عمل کے ساتھ کر کے دیکھا جائے کہ دونوں کے درمیان مشابہت کتنی ہے اور فرق کتنا؟ اور اگر فرق ہے تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ راقم السطور کا احساس یہ ہے کہ مولانا مودودی نے عصر حاضر کے ذہن و مزاج کو اپنے ہم عصر اعیان تحریک اسلامی سے بہتر طور پر سمجھا تھا۔ اسی لیے انھوں نے زیادہ زور پر امن آئینی و جمہوری ذرائع سے ایک طویل المیعاد منصوبے کے تحت رائے عامہ کو ہموار کرنے پر صرف کیا۔ اس کے علاوہ بنیادی امور کی پیہم وضاحت کرتے ہوئے وہ کردار سازی پر بیش از بیش توجہ دیتے رہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کے بعد آیندہ مرحلے میں کوئی حقیقی پیش رفت اسی وقت ہو گی جب واقعات کا ایک تنقیدی جائزہ لے کر تحریک کو اس کے اصلی انداز اور فطری رفتار سے اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ وہ عملاً پوری زندگی پر اثر انداز ہو۔

سوم: اس مقصد کے لیے تنظیم کے ضوابط پر نظر ثانی کرنی ہو گی اور بدلتے ہوئے حالات میں ایسے مردان کار پر تنظیم کا دروازہ زیادہ سہولت کے ساتھ کھولنا ہو گا جو تحریک کو آگے بڑھانے کی اقدامی صلاحیت رکھتے ہوں تاکہ انفرادی محاسبے سے بڑھ کر اجتماعی معاملے میں سبقت کی راہ ہموار ہو۔ ضابطہ پسندی مفید ہوتی ہے مگر ضابطہ بندی مضر۔ نصب العین مستقل ہو سکتا ہے مگر طریق کار متغیر، ورنہ تحریک جمود سے دوچار ہو گی۔ ایک بڑی تحریک کے قافلے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو ہر جہت سے قافلے کو منزل مقصود کی طرف بڑھاتے ہیں۔ لہٰذا تنظیم کے اندر وسعت ہونی چاہیے جس

کے بغیر نہ تو وسائل میں اضافہ ہو سکتا ہے نہ بہتر مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ پورے سماج پر اثر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ سرگرمیوں میں تنوع ہو اور وہ اپنے دور کے ماحول کا احاطہ کر سکیں۔ اسلامی نظریہ زندگی اس جامعیت کے بغیر معاشرے میں نافذ ہو ہی نہیں سکتا' جب کہ ریاست کے انتظام پر حاوی ہونا ناقابل تصور ہے۔ ایک زندہ و فعال اور موثر تحریک کی تنظیم زندگی کے مختلف دائروں میں ہر طرح کے جوہر قابل کی پذیرائی کرتی ہے اور افراد کو ان کی کارکردگی' نہ کہ محض وابستگی' کی بنیاد پر کام کرنے کے اختیارات دیتی اور ذمہ داری کے مناصب پر فائز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں تحریک اسلامی کو جلد از جلد اپنا محاسبہ کر کے تنظیم کے اندر درستی و مستعدی اور چستی پیدا کرنی چاہیے' ورنہ محض لٹریچر کی اشاعت و تقسیم بلکہ مطالعہ بھی ایک افیون بن کر وابستگان کو فقط ذکر و فکر میں مست رکھے گا۔

چہارم: عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے اور جدید ذہن کو خطاب کرنے یا نئی نسل کی کردار سازی کے لیے مشرق و مغرب دونوں جگہ تحریک اسلامی کا وہی انداز صحیح و موثر ہو گا جو مولانا مودودی نے قرآن و سنت کی روشنی میں اختیار کیا۔ اس سلسلے میں آج کے مسلم دانش وروں کو امریکہ اور یورپ کی تکنیکی ترقی سے مرعوب اور ایشیا و افریقہ کی موجودہ مغرب زدگی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ جدیدیت اور تجدد کوئی کار تجدید نہیں ہے۔ جو کچھ تمدن و تہذیب اہل مغرب نے پیش کیا ہے اسے ایک نئی جاہلیت پر مشتمل قرار دینا کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔ دانش حاضر کے اس سحر قدیم کا مقابلہ کرنے کے لیے' علم کلام گذشتہ نصف صدی کے اندر اسلامی لٹریچر میں فروغ پا چکا ہے۔ مسلم دانش وروں کو اعداد و شمار کی جادوگری کے بجائے حقائق کی تصریح پر زور دینا چاہیے اور اقدام و عمل سے کام لینا چاہیے۔ انقلاب مفاہمت سے نہیں' مجاهدے سے رونما ہوتا ہے۔

پنجم: تحریک اسلامی کے لیے ایک حل طلب مسئلہ ان سوالات کا جواب دینا ہے جو آج مختلف ملکوں میں مختلف طریقے سے سیاست و معیشت و معاشرت کے دائرے میں جمہوریت کی نوعیت' سود کی حقیقت اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں اٹھ رہے ہیں یا اٹھائے جا رہے ہیں۔ جمہوریت تو بہرحال شورائیت کی ایک شکل ہے' جس کی اصلیت خلافتِ راشدہؓ کے دور میں نمونے کے طور پر دنیا کے سامنے آ چکی ہے اور اس کی موجودہ شکل بعض معمولی ترمیمات کے ساتھ قابل قبول ہو سکتی ہے' بلکہ اس کی اصلاح کے لیے بھی اس کے مروجہ عمل میں شرکت کی جا سکتی ہے' جس کے لیے پیشگی شرط لگانے کی نہ تو ضرورت ہے نہ اس کا موقع۔ سود کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے' اور خاص کر غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں عملاً ایک مدت کے لیے ناقابل تصفیہ' جس کے دوران میں موجودہ بینکنگ سسٹم سے بالکل الگ رہنا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کیا اضطراری طور پر اور محتاط طریقے سے اس میں شرکت نہیں کی جا سکتی؟ عورتوں کے حقوق جس حد تک اسلام نے شروع سے دے رکھے ہیں آزادی نسواں

کی مغربی تحریک بھی نہیں دلا سکی ہے۔ بہرحال، یہ فقہی مسائل اگر اجتہاد کا تقاضا کرتے ہیں تو اس کو بھی مولانا مودودی کے لٹریچر نے بڑی اور بنیادی و عمومی حد تک پورا کر دیا ہے۔ عصر حاضر میں فقہ کی مکمل نئی تدوین، اس کے لیے مطلوب اجتہادی صلاحیت اور ضروری وسائل و مواقع نمایاں طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ بروقت اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کہ مجالس قانون ساز مستند علماے دین اور معتبر ماہرین قانون کے باہمی مشورہ و تعاون سے علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق اجتماعی اجتہاد سے کام لیں، بشرطیکہ مسلم رائے عامہ ان کے فیصلوں پر اعتماد کا اظہار کر کے ان کو کھلے طور پر اپنی مرضی سے تسلیم کرے۔

ششم: کوئی تحریک مستقل و مسلسل فلاحی و رفاہی کاموں کے بغیر نہ تو پایدار ہو سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے۔ یہ کام وقتی و عارضی طور پر مصیبت زدوں کی راحت رسانی تک محدود نہیں ہو سکتا۔ اس کے وسیع دائرے میں مثالی بستیوں کا قیام و انتظام بھی شامل ہونا چاہیے اور عام لوگوں کو سماجی انصاف دلانے کے ادارے بھی۔ صنعت و حرفت کی تربیت اور روزگار و کاروبار کی فراہمی بھی حتی الوسع کرنے کے کام ہیں۔ ریاست اندرون ریاست بنانا اور چلانا تو محل نظر ہے اور مشکل بھی، لیکن معاشرے میں متبادل نظام کے طور پر اسلامی نظام حیات کے غیر سرکاری نمونے پیش کرنا عام لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے علاوہ تحریک کے کارکنوں کی تربیت کے لیے بھی مطلوب ہے۔

ہفتم: علوم و فنون اور ادبیات میں اسلامی نقطہ نظر کی پیش کش ان دائروں کے معروف و مسلم ضوابط و لوازم کے مطابق ہونی چاہیے، تاکہ معیار کا تعین ہو سکے اور اہل نظر ایک خوش گوار تبدیلی و ترقی کا احساس کر سکیں، ورنہ نعرہ بازی اور بلند بانگ دعوے بے اثر ہوں گے۔

ہشتم: سیاست وقت میں ایسی فراست و جرات سے کام لینا ہے کہ ایک اقدامی قیادت بھی بن سکے اور تحریک کو آگے بڑھانے کی راہیں بھی ہموار ہوں۔ اس سلسلے میں فقیہانہ تاملات سے کام نہیں چلے گا، حکیمانہ پیش قدمی سے کام لینا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ایک تو حالات حاضرہ کا پورا ادراک ضروری ہے، دوسرے حل مسائل کی موثر تدبیر۔ اس سلسلے میں جدوجہد کی تدریج و ترتیب جو بھی ہو، حقیقت پسندی و بصیرت مندی اور پیہم حرکت و عمل ضروری ہے۔ عصر حاضر میں سیاسی بے خبری اور غفلت یا سستی کے ساتھ کوئی تحریک چل نہیں سکتی، نہ اس کو مردان کار مل سکتے ہیں، نہ وہ رائے عامہ پر اثر ڈال سکتی ہے، یہاں تک کہ اس کی صحیح پہچان بھی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کھلی چھوٹ بد خواہوں کو آسانی سے ملتی رہے گی۔ سیاسی سرگرمیوں سے بیگانہ رہ کر ایک کلی نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے اسلامی نظریے کا نہ تو تعارف ہو سکتا ہے نہ اس پر عمل۔ قانون سازی اور نظم حکومت کو نظرانداز کرنے کا مطلب ہے ترک دنیا اور نتیجہ محکومی و مجبوری و مسکینی و نومیدی جاوید۔

نہم: پسماندہ اقوام و طبقات اب اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کی تلافی اور ان کے سدباب کے لیے سماجی انصاف اور مساوات سے بڑھ کر اقتدار کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ ایام کی گردش کا تقاضا بھی ہے اور چیرہ دستوں کے خلاف فطرت کی تعزیر بھی۔ اس سلسلے میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظریہ ایسا نہیں جو ان اقوام و طبقات کی تسلی اور ان کے عزائم کی تکمیل کر سکے' مگر ان کے اور اسلام کے درمیان مسلمان ہی اپنی شامت اعمال سے دیوار بن کر کھڑے ہیں۔ لہٰذا تحریک اسلامی کو اپنی تبلیغ اور کارگزاری سے یہ دیوار گرانی ہوگی' تاکہ اسلام کا اصلی چہرہ لوگوں کی نگاہ میں آسکے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں قرآن کے لفظوں میں مستضعفین کہنا چاہیے' یعنی ایسے لوگ جو پیہم استحصال سے کمزور بنا کر رکھے گئے' لیکن اگر وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوں تو عباد الصالحون یعنی نیک بندے بن کر قرآنی لفظوں میں زمین کے وارث و مالک ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بھارت کے اچھوتوں کو وہ برابری اور برادری مسلم سماج سے باہر کہیں نہیں مل سکتی جس کے وہ طالب اور آرزومند ہیں' اس لیے کہ ہندو سماج ان کو ہریجن بنانے کے سوا کچھ کر نہیں سکتا اور بدھوں یا عیسائیوں کا کوئی قابل ذکر سماج ملک میں ہے ہی نہیں۔ چنانچہ صنم خانے سے کعبے کو پاسباں مل سکتے ہیں' اگر کعبے کے متولی اس کے روادار ہوں۔ اس رواداری کا ایک ثبوت دینے کے لیے مسلم سماج کے اندر محض معاشی یا سیاسی مفاد کے لیے پس ماندہ ذاتوں کی جو تفریق زبردستی کی جارہی ہے اس کو روکنا اور ختم کرنا ہوگا۔

دہم: تحریک اسلامی کو ایک تحریک انسانیت کی شکل میں آگے بڑھنا ہوگا۔ مسلمان کوئی مذہبی و نسلی فرقہ نہیں' ایک نظریاتی ملت ہیں اور ان کا نظریہ آفاقی ہے۔ لہٰذا دنیا کی فرقہ وارانہ' طبقہ پرستانہ اور قوم پرستانہ کش مکش میں ملت اسلامیہ ہی ثالث بالخیر بن سکتی ہے۔ اسلامی توحید کا پیغام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ اس معاملے میں اکثریت اور اقلیت کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں' سوال صرف نظریاتی قوت' اس کے شعور اور اس کے مطابق کردار کا ہے' جس کی توقع تحریک اسلامی سے ہی کی جا سکتی ہے' اور اس کی تکمیل کے بغیر ملت اور انسانیت کے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

ان نکات کی روشنی میں تحریک اسلامی کو ماضی کی تاریخ سے سبق لے کر اپنی کوششوں کا ہدف مستقبل کی بہتری کو بنانا چاہیے۔ روایت کا پورا احترام کرتے ہوئے فکر و عمل کی جدت سے کام لینا چاہیے' واقعات کو مدنظر رکھ کر تجربات کرنا چاہیے۔ اقدار کا تحفظ ہر حال میں کیا جائے' مگر مسائل سے صرف نظر کسی حال میں نہ کیا جائے۔ ماضی کی یاد اور مستقبل کی امید دونوں کی بقا کا انحصار حال کی سعی و جہد پر ہے۔ لہٰذا آیندہ مرحلے میں تحریک اسلامی کو حقیقت پسندی اور اولوالعزمی' دونوں کے ساتھ گامزن ہونا چاہیے۔

رسائل و مسائل

تعویذ اور شرک

آپ نے کلامِ نبوی کی صحبت میں (ص ۹۶) رقی نسترقیھا کا ترجمہ کرتے ہوئے دعا کے ساتھ تعویذ بھی لکھا ہے۔ احادیث صحیحہ میں تعویذ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ اگر دعا کے ساتھ دم کرنے کا ذکر ہوتا تو قابلِ اعتراض نہ ہوتا۔

آپ نے ترجمان میں تقدیر کے سلسلہ میں شائع ہونے والی ایک حدیث کے بارے اپنے اضطراب کا اظہار کیا ہے اور محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے تفصیلی اقتباسات بھیجے ہیں جو تعویذ کو شرک قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو چند باتوں پر غور کرنے کی دعوت دوں گا۔

۱۔ میں نے رقی نسترقیھا کا ترجمہ ''دعا تعویذ'' مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم کی کتاب زادِ عمل سے درج کیا تھا۔ سلف سے یہی روش چلی آرہی ہے اور میری بھی روش یہی ہے کہ جن علما پر اعتماد ہو کہ دین کا صحیح علم و فہم رکھتے ہیں، ایک کم علم والا آدمی ان کی پیروی کرے تو یہ احتیاط اور خیر کی روش ہے۔ الا یہ کہ میرے علم کی حد تک مجھے کوئی بنیادی اختلاف یا اضطراب محسوس ہو۔

۲۔ یہ بات مجھے بھی معلوم تھی اور یقیناً مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم کو مجھ سے بدرجہا زیادہ بہتر معلوم ہوگی، کہ یہ لفظ پڑھ کر پھونکنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں، اور شاید وہ بھی یہ سمجھتے ہوں کہ جب تک نفع و ضرر کی نسبت صرف اللہ کی طرف رہے، اس وقت تک تعویذ جھاڑ پھونک کی طرح کا عمل ہے۔ ایک عمل میں الفاظ منہ سے ادا کیے جاتے ہیں، دوسرے عمل میں کاغذ پر لکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے غالباً انھوں نے ترجمے میں وسعت اختیار کی، اور اسی لیے میں نے اس میں کوئی بات غلط نہیں سمجھی۔ ترجمہ لفظی نہ ہو، تو روایت بالمعنی کی طرح، تھوڑی بہت تشریح و توضیح اس میں داخل ہو جاتی ہے۔

۳۔ میری نظر میں شرک کا تعلق بنیادی طور پر عقیدے سے ہے اور پھر ان اعمال سے جو واضح طور پر عبودیت کے اظہار یا سلسلہ اسباب و علل سے بالا ہو کر کسی غیراللہ کے لیے نفع و ضرر کی نسبت پر مشتمل ہوں۔ یا کسی بھی غیراللہ کو، ماسوا اللہ مطلقاً نافع و ضار سمجھے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی یہ سمجھے کہ شفا دوا سے نصیب ہوتی ہے، نہ کہ اللہ کے دینے سے، تو یہ بھی شرک ہوگا۔ کوئی کلامِ الٰہی سے جھاڑ

پھونک کرے اور عقیدہ یہ ہو کہ اصل نافع و ضار تو اللہ تعالیٰ ہے، یہ جھاڑ پھونک محض ذریعہ ہے، تو یہ شرک نہ ہو گا۔ جس طرح دوا میں تاثیر حکم الٰہی سے ہے، اسی طرح جھاڑ پھونک میں تاثیر حکم الٰہی سے ہے۔ اسی طرح جو شخص تعویذ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ذریعہ ہے، اصل نفع و ضرر حکم الٰہی پر منحصر ہے، تو یہ بھی شرک نہ ہو گا۔ اسی لیے امت کے بے شمار اکابر اور صلحا تعویذ لکھ کر دیتے رہے ہیں۔

۴۔ جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن میں گلے میں کچھ لٹکانے یا ہاتھ میں کوئی زرد یا دوسرا دھاگا باندھنے کی مخالفت کی گئی ہے تو ان کا تعلق یقیناً واضح طور پر اس دور کی مشرکانہ رسوم اور بتوں سے ہو گا۔ اس لیے ان سے منع کیا گیا۔ اس کے برخلاف تعویذ کا تعلق کلام الٰہی یا کلمات خیر سے ہے، اور اس میں مشرکانہ الفاظ یا عقیدہ نہ ہو، تو اس پر یہ مخالفت وارد نہ ہو گی۔

۵۔ اسی لیے امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب الکلم الطیب میں، ابو داود اور ترمذی کے حوالے سے، یہ روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن عمر اپنے سمجھ دار بچوں کو یہ کلمات سکھاتے تھے اور ناسمجھ بچوں کے گلے میں لٹکا دیتے تھے: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ، من غضبہ وشر عبادہ، ومن همزات الشیاطین وان یحضرون۔ اس حدیث کی سند میں کلام کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کیوں کہ یہ ان کا عمل تھا اس لیے یہ حجت نہیں لیکن سلف تابعین میں سے بعض نے تعویذ کی اجازت دی ہے، اور بعض نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اب صرف شیخ محمد بن عبدالوہاب کے استنباط و اجتہاد کی بنیاد پر اس کو قطعی اور صریح ممنوع اور شرک کو قرار نہیں دیا جا سکتا، نہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور مولانا تھانوی جیسے جید علما جانتے بوجھتے عمل شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔

۶۔ آخری بات جو میں اس قسم کے تمام مسائل میں اپنے احباب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں یہ ہے کہ جزئی و فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے اور ہو گا۔ اس وقت مسلمان جس عرصہ محشر میں ہیں، ان کے سامنے جو چیلنج اور کام ہے، اس کے پیش نظر احیاے اسلام کے علم برداروں کو اس قسم کے مسائل کی طرف توجہ کرنے اور ان میں پڑنے کی فرصت و مہلت ہی نہ ہونا چاہیے۔ (خرم مراد)

عادت بد کا ترک

ہم دو دوست ہیں۔ دین کا کام مل جل کر کرتے ہیں۔ قرآن مجید کا اور اسلامی کتب کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے اندر ایک بہت بری عادت پائی جاتی ہے۔ جب ہم اکٹھے رہتے ہیں تو وہ ہم سے نہیں چھوٹتی۔ جب کچھ دنوں کے لیے ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں تو مسئلہ ٹھیک رہتا ہے لیکن ہمارے دوسرے ساتھی سمجھتے ہیں کہ یہ آپس میں ناراض ہیں۔ ہروقت پریشانی اور الجھن کا شکار رہتے ہیں۔ خدارا ہمیں اس کا علاج بتائیں، کوئی ایسا عمل صالح، یا وظیفہ، کہ دنیا کی محبت ختم ہو جانے اور صرف

اللہ' اور اس کے رسول کی محبت دل میں آ جائے۔

اگر آپ دونوں دوست دین کا کام بھی کرتے ہیں' اسلامی کتب اور قرآن مجید کا باقاعدہ مطالعہ بھی کرتے ہیں' پھر بھی اپنی کسی عادت بد پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوتے' تو اس کے علاج کے لیے آپ درج ذیل باتوں کو سامنے رکھیں' اور جن پر عمل کرنا ہے ان پر عمل کریں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں انھی کاموں سے روکا ہے جن سے رکنا ہمارے اختیار میں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمیں کسی ایسی بات کا حکم نہیں دے گا جو ہمارے اختیار سے باہر ہو' جس سے رکنا ہمارے بس میں نہ ہو۔ یہ یقین ضروری ہے۔

۲۔ دوسری بات جس کا اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جہاں اپنے اختیار سے کچھ کرنا یا نہ کرنا ضروری ہو' وہاں کوئی ایسا نسخہ نہیں کہ اپنا اختیار استعمال کر کے اور عمل کر کے رک جانے کے علاوہ بھی رک جانا ممکن ہو۔ اس لیے کہ سارا اجر و ثواب تو اسی اختیار کے استعمال پر ہے۔ گناہ کی ترغیب اور خواہش ختم ہو جائے تو پھر آزمائش کیسے ہوئی۔ پھر تو ہم فرشتے ہو جائیں گے' انسان نہیں رہیں گے۔ اپنی قوت ارادی سے اپنا اختیار استعمال کرنے کا کوئی بدل نہیں' یہ آپ نہ کریں تو کوئی چیز آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ آپ کریں تو اللہ' فرشتے' دعائیں اور بہت سی تدابیر آپ کی قوت ارادہ اور استعداد عمل کو مضبوط بنانے میں آپ کی مدد کریں گے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ سارے اعمال کا محرک تو ارادہ ہے اور ارادہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں سے اپنا کام کرتا ہے۔ یہ ارادہ آپ کے خیالات کا تابع ہوتا ہے۔ اچھے اور پاکیزہ خیالات دل پر طاری ہو گئے تو نیک ارادے مضبوط ہوں گے۔ برے اور غلیظ خیالات دل میں غالب ہوں گے' تو نیک ارادے کمزور اور بد ارادے مضبوط ہوں گے۔

۴۔ برے خیالات کو دل میں آنے سے بھی آپ نہیں روک سکتے' اس لیے کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں۔ ان کو لڑ بھڑ کر بھی اپنے دل سے نہیں نکال سکتے اس لیے کہ جتنا آپ برے خیالات کی طرف توجہ دیں گے وہ قائم اور مضبوط ہوں گے۔

۵۔ اس لیے برے خیال کو آپ دروازے ہی پر روک دیں' داخل ہوتے ہی روشنی کا سوئچ آن کر دیں۔ اندھیرے فرار ہو جائیں گے۔ یہ دروازے کا پہرے دار اور روشنی کا منبع اللہ کی یاد ہے۔ وہ میرے ساتھ ہے' یہاں موجود ہے' مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے حاضر ہو کر اس خیال کو راہ دینے یا اس پر عمل کرنے کا مواخذہ ہو گا' اس مواخذہ کا تصور بھی دل میں لایئے۔ مزید ممکن ہو تو خاموشی سے' پورے دل سے' مگر بڑی تیزی سے اللہ اللہ' اللہ میرے رب' اللہ تیرا شکر' اللہ اپنی پناہ میں رکھ' اس کا بڑی تیزی سے ورد شروع کر دیں' اتنی تیزی سے کہ دل میں اور کچھ آنے نہ پائے۔

۶۔ ان چیزوں سے بچیں جو اس مخصوص غلط خواہش کو تقویت دیتی ہوں' جو آپ کو گناہ میں مبتلا کرتی ہوں۔ مثلاً پاکیزہ چیزیں پڑھیں' نگاہ کی حفاظت کریں۔ عموماً لوگوں کے سامنے رہیں۔ جب آپ خود جانتے ہیں کہ اکٹھے ہوتے ہیں تو عادت نہیں چھوٹتی' علیحدہ ہوتے ہیں تو مسئلہ ٹھیک رہتا ہے' تو پھر آپ علیحدہ کیوں نہیں رہتے۔ دوسرے ساتھی سمجھتے ہوں کہ آپ آپس میں ناراض ہیں تو سمجھا دیں۔ دوسروں کے سامنے آپ بڑے تپاک سے ملیں' تنہا نہ ہوں۔ یہ علیحدہ رہنا آپ کے اختیار میں ہے۔

۷۔ اس کے بعد بھی گناہ ہو سکتا ہے' بار بار ہو سکتا ہے۔ بس فوراً ہی استغفار کریں' توبہ کریں' روئیں' گڑگڑائیں اور ندامت کے آنسوؤں سے اس داغ کو دھو دیں جو گناہ کے نتیجے میں دل پر پڑ جاتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے اوپر نفلی عبادات (نوافل' روزے) اور صدقات کا کوئی جرمانہ بھی عائد کرلیں۔

۸۔ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ کوئی ایسا عمل صالح یا وظیفہ پایا جاتا ہے جو آپ کے دل سے دنیا کی محبت ختم کر دے' گناہ کی کشش اور خواہش ختم کر دے اور اپنے ارادے کو اور کوشش کو استعمال کر کے گناہ سے بچنے کی جو ذمہ داری اللہ نے آپ پر ڈالی ہے اس ذمہ داری سے آپ کو بری کر دے۔ دنیا کی محبت اور گناہ کی خواہش تو اللہ نے آپ کے اندر رکھی ہے۔ یہی آپ کے لیے بلندی درجات کا بھی ذریعہ ہے اور اسفل السافلین میں جانے کا بھی۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس)

میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔ اس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا لیکن وہ مدد انھی کی کرتا ہے جو اس کی طرف رخ کریں اور اپنی سی کوشش کریں۔ (خ - م)

چہرے کا پردہ

ایک مسئلہ جو اکثر کشیدگی کا سبب بنتا ہے وہ پردہ کا مسئلہ ہے۔ ایک ہی تنظیم میں مختلف اکابرین متضاد نقطہ نظر پیش کرتے ہیں جس سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ کچھ دن ہوئے ڈاکٹر کمال جلباوی صاحب نے ایک اجتماع سے خطاب کیا جس میں خواتین پیچھے پردے میں تھیں تو انھوں نے فرمایا کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسی قسم کا اظہار ایک دوسرے اجتماع میں ڈاکٹر درش نے بھی کیا۔ یہ نقطہ نظر رکھنے والے لوگ آپ کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ آپ بھی یہی رائے رکھتے ہیں' جب کہ دوسرے لوگ جو کہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں اور ان کے خیالات کو پیش کرتے ہیں تو ان کے متعلق یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا پاک و ہند کے معاشرتی ماحول سے متاثر ہیں۔

چہرے کے پردے کا مسئلہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ ایک تنظیم میں' جو دین کے غلبے کے وسیع تر مقصد کے لیے بنی ہو' ایک اختلافی مسئلے پر مختلف اور متضاد رائے رکھنے والے لوگ جمع ہو سکتے ہیں' اور انھیں جمع ہو جانا چاہیے۔ تنظیم تو ایک وسیع چیز ہے' ایک مسلک میں مختلف و متضاد آرا والے لوگ جمع

ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ کئی مسائل میں امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف و محمد کی رائے بالکل متضاد ہے۔ مگر تینوں حنفی فقہ کے امام ہیں۔ یہ اختلاف کشیدگی کا سبب کیوں بنے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک صرف اپنی رائے کو درست سمجھتا ہے' محتمل بالخطا بھی نہیں سمجھتا اور دوسری رائے کو غلط اور خطا سمجھتا ہے۔ اس میں شدت سے کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔

اگر ڈاکٹر کمال هلباوی اور شیخ درش جیسے لوگ یہ کہیں کہ خواتین کا پردے کے پیچھے بیٹھنے کا "طریقہ درست نہیں" تو انتہائی تعجب کی بات ہے۔ یہ دلیل کہ حضورؐ کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا' انتہائی کمزور دلیل ہے۔ بے شمار کام جو حضورؐ کے زمانے میں نہیں ہوتے تھے' خلفائے راشدین سے لے کر آج تک ہو رہے ہیں۔ جب تک کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے کے لیے نص نہ ہو' اس وقت تک کوئی چیز صرف اس لیے نادرست نہیں ہو سکتی کہ حضورؐ کے زمانے میں نہیں ہوئی ہے' نہ اس لیے کرنا ضروری ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں ایسے ہوتی تھی۔

جو مولانا مودودی کی رائے کو پاک و ہند کے معاشرتی ماحول سے متاثر قرار دیتے ہیں' ان کا علم بڑا محدود اور ناقص ہے۔ یمنیوں میں' ترکوں میں' آج کل بھی مشرق وسطیٰ میں سلفیوں میں' چہرے کے پردے کا اہتمام رہا ہے یا ہے اور اجتماعات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس دلیل پر تو ہمارے مغربی کرم فرما سارا سرمایہ فقہ ہی دریا برد کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دور ملوکیت کی پیداوار ہے۔ پھر مشترک اجتماع اور چہرہ کھلا رکھنے کے اجتہاد کو بھی مغربی تہذیب کا اثر قرار دیا جا سکتا ہے حالانکہ اس کے دلائل قرآن و سنت میں موجود ہیں۔

اسی طرح یہ سمجھنا کہ جو چہرہ نہیں ڈھانکتیں وہ کسی معصیت کا ارتکاب کرتی ہیں' یا حجاب کے اہتمام کے ساتھ مخلوط اجتماع غلط ہے' وہ بھی صحیح نہیں۔ پردہ ڈال کر الگ اجتماع کیا جائے تو وہ بھی صحیح ہے' مسجد نبویؐ میں اجتماع نماز کی طرح کا مشترک اجتماع کیا جائے تو وہ بھی صحیح ہے۔ یہ افراد' تنظیم' معاشرتی حالات اور موقع و حالات پر منحصر ہے۔

میں چہرے کے پردے کی رائے کو راجح سمجھتا ہوں' الگ الگ اجتماع کو پسندیدہ سمجھتا ہوں لیکن مغرب کی دنیا میں' اگر عورتیں حجاب کا اہتمام کریں' تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ مرد مقرر ان سے بغیر پردہ ڈالے خطاب کرے یا مشترک اجتماع ہو' خصوصاً اگر تعلیمی ضرورت یا وقت کی قلت کی وجہ سے ایسا ضروری ہو۔



ADARTS - HRA - 1/94

کتاب نما

بنک کا سود: اقتصادی اور شرعی نقطہ نظر سے ' ڈاکٹر محمد علی القری۔ ترجمہ: عتیق اظفر۔ اہتمام و اشاعت: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' بلاک ۱۹' مرکز ایف ۷' اسلام آباد' صفحات: ۸۷' قیمت: درج نہیں۔

سود ایک کالاکھوں کے لیے مرگ مفاجات' مگر عصر حاضر میں سود اور سودی کاروبار کو انسانی زندگی کا اس طرح جزو لاینفک سمجھ لیا گیا ہے' جس طرح ہوا' پانی اور غذا---- مصنف کے بقول ''تمام آسمانی مذاہب میں اس [ربا] کی حرمت کے باوجود بعض گروہ مسلسل غیر شرعی طریقوں اور مختلف حیلوں کا سہارا لے کر ربا کا لین دین کرتے رہے۔ ان میں اہم گروہ یہود کا ہے'' (ص ۹)۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان معاشی دعووں اور شبہات کا جواب دیا گیا ہے' جو آج کل بنکوں کے سود کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ پھر اس پہلو کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ معیشت کو سودی آکاس بیل سے بچاکر کیسے وہ نظام وضع کیا جا سکتا ہے' جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہو۔ آج کل غیر سودی بنکاری کے تجربات کو جن مشکلات کا سامنا ہے' ان کو بھی موضوع بناتے ہوئے یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اسلامی بنکاری کے تجربات میں "مشارکت" کو مناسب اہمیت دینے کے باوجود' اسلامی بنکاری کے نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی (ص ۲۳)۔

مصنف نے ان جدیدیت پسندوں کے نقطہ نظر کا محاکمہ کیا ہے' جو موجودہ بنکاری سودی نظام کے بارے میں عام مسلمانوں کو تذبذب' مغالطے اور دھوکے میں ڈال رہے ہیں کہ ''بنک کا سود حرام نہیں'' (ص ۱۷)۔ چونکہ ''ربا کی حرمت کتاب و سنت رسولؐ سے قطعی طور پر ثابت ہے' اس لیے بنک کا سود بھی ربا ہے'' (ص ۵۳)۔ ڈاکٹر محمد علی نے فقہی اصطلاح "مصلحت" اور "سد ذرائع" کے پردے میں جدید بنکاری کے لیے جواز پیدا کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ: "ضرورت" کے شرعی طور پر معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ چیزوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد کے وجود کے لیے خطرہ ہے' جن کی حفاظت کے لیے شریعت آئی ہے یعنی: دین' جان' نسل' مال اور عقل اور یہ خطرہ بھی قطعی اور یقینی ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ بات قبول کرنا مشکل نظر آتی ہے کہ سود کی بنیاد پر لین دین ایسی ضرورت ہے' جو ''حرام کو حلال کر دے'' کیونکہ اس بنیاد پر

لین دین کرنے سے شریعت کے متذکرہ بالا پانچ مقاصد میں سے کسی ایک کو بھی خطرہ لاحق نہیں ہوتا (ص ۵۲)۔

کتاب کے مقدمے میں پروفیسر خورشید احمد نے لکھا ہے کہ: ''عام مسلمان 'ربا' سود' یو ژری' انٹرسٹ یا بیاج' اسے کسی بھی نام سے پکاریں' اس سے پناہ مانگتا ہے اور اگر کسی وجہ سے اس میں ملوث ہوا ہے تو اسے گناہ سمجھتا ہے' یہ ہے امت کا اجتماعی ضمیر۔ البتہ اقتدار کے حلقوں اور اہل ثروت کے دائروں میں سود کے جواز کے لیے کوئی نہ کوئی چور دروازہ نکالنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ وہ طبقہ جو مغربی اقدار کو عملاً قبول کر چکا ہے' یا جن کا مفاد مغرب کے سودی نظام سے وابستہ ہے' وہ مسلسل ایسی بحثوں کو ہوا دیتے رہے ہیں' جن کے نتیجے میں سود کی حرمت کو مشتبہ بنایا جا سکے' اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ''حلالہ'' کیا جا سکے'' (ص ۵-۶)۔ ''افسوس وہاں ہوتا ہے جہاں پڑھے لکھے افراد بھی دلیل کے بجائے مفاد اور مصلحت کا سہارا لے کر دین کے مثبت [اور واضح] احکام میں تبدیلی کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ راستہ حق و دیانت کا راستہ نہیں'' (ص ۷)۔

ڈاکٹر محمد علی نے بنک کے سود کے بارے میں تمام اعتراضات کو یک جا کر کے' ایک ایک کا جواب دیا ہے اور وضاحت کے ساتھ اسلامی نظم معیشت پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول خورشید صاحب: ڈاکٹر محمد علی القری کا اسلوب نہ جارحانہ ہے اور نہ معذرت خواہانہ۔ انھوں نے نہایت ٹھنڈے اور خالص علمی انداز میں ایک ایک پہلو پر بحث کی ہے اور ان تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے' جو اس بحث میں بار بار اٹھائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں افراط زر اور اس کے نتیجے میں قدر زر میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی انہوں نے سیر حاصل بحث کی ہے اور سود کے جواز کے استدلال کی کمزوری بھی واضح کر دی ہے'' (ص ۷-۸)۔ کتاب کے آخر میں سود کے حرام ہونے کے بارے میں عرب اسکالروں اور مغرب کے اہل دانش کی آرا بھی ایک ضمیمے میں پیش کی گئی ہیں۔ بظاہر یہ مختصر کتاب ہے' لیکن فی الحقیقت ایک بہت بڑے مسئلے کی وضاحت اور تنقیح کرتی ہے۔ ایک عام قاری فقہ کی باریکیوں اور علم معاشیات کی وسعتوں اور پیچیدگیوں سے گھبرا کر اس کوچے کا رخ کرنے سے پہلو بچاتا ہے' یہ کتاب نفس موضوع کو عام فہم' مدلل اور خوشگوار انداز سے اس کے ذہن نشین کر دیتی ہے۔

اس مقالے کے مصنف' اور مترجم عتیق الظفر دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ معاشیات کے اساتذہ' علما اور طلبہ تک اس کتاب کی رسائی ممکن بنائی جانی چاہیے۔ (سلیم منصور خالد)

ہم آغا خانی کیسے مسلمان ہوئے؟ اکبر علی غلام حسین' تلخیص و ترجمہ: محمد اکبر خان۔ ناشر: اسماعیلیہ نمازی خدمت کمیٹی' مسلم اسماعیلیہ مسجد' بلاک ۷' فیڈرل بی ایریا نزد عائشہ منزل' پوسٹ بکس ۸۱۲۴ کراچی ۷۵۹۵۰۔ صفحات: ۵۳۱۔ قیمت: ۲۰۲ روپے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ ان کے والد پکے آغا خانی تھے۔ ان کے دادا بھانجی نتھو' اسماعیلی آغا خانی ہندوؤں میں سے تھے۔ والد کے پڑدادا کا نام پریم جی تھا۔ ڈیڑھ صدی پہلے راج کوٹ (بھارت) میں شدید قحط پڑا تو یہ لوگ کراچی آ بسے۔ اکبر علی اوائل عمر ہی سے اسماعیلی جماعت خانے جانے لگے' مگر وہاں کے طور طریقوں نے انھیں ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ان کا ذہن اس بات کو قبول نہ کرتا کہ "حاضر امام" (یعنی اپنے ہی جیسے انسان) کو خدا سمجھ کر اس کی تصویر کو سجدہ کیا جائے۔ ہدایت تھی کہ انتہائے عبادت پر اللھم لک سجودی وطاعتی پڑھا جائے۔ "حاضر امام" ہی سے مرادیں مانگی جائیں وغیرہ۔ اکبر علی جماعت خانے سے ہر روز سوالوں کا ذخیرہ لے کر آتے اور گھنٹوں حیران اور متفکر رہتے۔ آخر ایک روز' ریڈیو پاکستان کے دینی پروگرام میں نشر ہونے والی' ایک آیت قرآن (کے ترجمے) نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کچھ روحانی سکون میسر آیا۔ قرآن کا مطالعہ شروع کیا اور اللہ نے ہدایت نصیب فرمائی۔

زیر نظر کتاب بطور آپ بیتی لکھی گئی ہے مگر اس میں ذاتی حالات کم ہیں اور اسماعیلیوں کی تاریخ' عقائد' عبادات' آغا خانیوں کا ارتقا' جماعت خانوں کے رسوم و آداب' آغا خان سوم اور چہارم کے حالات' مشاغل حیات' ان کی بے پناہ دولت' عیش و عشرت' معاشقوں' گھڑ دوڑوں اور اسماعیلی مخفی طور طریقوں کی تفصیل زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اصحاب (بشمول تبصرہ نگار) ان باتوں سے ناواقف ہیں۔ بعض باتیں بہت چونکانے والی ہیں' مثلاً: آغا خاں "حاضر امام" کا مقام و مرتبہ' نعوذ باللہ' خدا کا ہے۔ اصل عبادت خانہ "جماعت خانہ" ہے' نہ کہ مسجد۔ ۱۹۸۳ میں مرحوم صدر محمد ضیا الحق' آغا خان میڈیکل یونی ورسٹی کا چارٹر عطا کرنے گئے تو احاطے میں ایک مسجد کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔ یونی ورسٹی تو بن گئی مگر مسجد کی تعمیر اسی سنگ بنیاد کے مرحلے پر رکی ہوئی ہے۔ اکبر علی تعجب سے پوچھتے ہیں' یادگاری پتھر کو وہاں سے غائب کیوں نہیں کیا گیا (ص ۱۰۹)۔ آغا خانیوں کا عقیدہ ہے کہ آغا خان "حاضر امام" کا دیدار ہو جانے پر سابقہ زندگی کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور حج کا ثواب بھی ملتا ہے۔ خود آغا خان نے کبھی حج نہیں کیا (ص ۲۷۲-۲۷۳)۔ آغا خان سوم فلسطین میں صیہونی سلطنت کے نہ صرف حامی تھے بلکہ ۱۸۹۸ میں انھوں نے عثمانی خلیفہ عبدالحمید سے اس کے لیے سفارش بھی کی تھی (ص ۱۰۰)۔ اسماعیلی' ہندو سماج میں ہندوؤں جیسے نام رکھتے ہیں اور انھی کے سے طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔ مصنف کے آباء و اجداد میں سے بعض بیک وقت ہندو بھی تھے اور اسماعیلی بھی (ص ۱۷۱)۔ بعض خاص مجالس کی رکنیت کے لیے بھاری فیسیں مقرر ہیں۔ ۱۲ سال کی عبادت ۱۲ سو روپے اور ۵ سال کی عبادت ۵ سو روپے ادا کرنے پر معاف ہو سکتی ہے' (ص ۲۸۲)۔ ایک عام قاری کے لیے آغا خانی مذہب کی لمبی تفصیل حیران کن اور کئی اعتبار سے پریشان کر دینے والی

ہے۔ دیوبند، سہارن پور، کراچی، اکوڑہ خٹک، الازہر اور سعودی عرب کے جید علما کے فتاویٰ کے عکس شامل کتاب ہیں جن میں قرار دیا گیا ہے کہ اسماعیلی مسلمان نہیں ہیں۔

مصنف نے یہ کتاب ''آگ کی طرف گامزن قدموں کو روکے جانے کا شعور'' پیدا کرنے کے لیے لکھی ہے۔ بلاشبہ جب کچھ لوگ مسلمان ہونے کے مدعی ہوں اور مسلم معاشرے میں کچھ سیاسی عزائم بھی رکھتے ہوں تو ان کے عقائد اور سرگرمیوں کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ جناب اکبر علی نے گھر کے بھیدی کی حیثیت سے، ذاتی معلومات، تجربات اور مشاہدے پر مبنی بہت سے دلچسپ اور عبرت ناک واقعات بیان کیے ہیں۔ کتاب میں نئی پرانی، دستیاب اور نایاب کتابوں کے حوالے اور نادر دستاویزات کے عکس بھی شامل ہیں۔ اصل انگریزی کتاب کا یہ ملخص ترجمہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

نیو ورلڈ آرڈر، امجد حیات ملک، ناشر: ۲۲۲۔ بی نیو چوبرجی پارک، چوبرجی، لاہور۔ صفحات: ۲۲۵۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہمارے نوجوان اور ملک و قوم کے ذمہ دار تاریخ کو کتنی اہمیت دیتے ہیں؟ اس کا اندازہ لازمی نصاب میں شامل تاریخ کے حصے سے کیا جا سکتا ہے۔ (اور اختیاری طور پر کتنے پڑھتے ہیں، یہ بھی کوئی راز نہیں ہے)۔ تاریخ کو قوم کا حافظہ کہا جاتا ہے۔ جسے مستقبل کی تعمیر اپنے نظریہ حیات کے مطابق کرنا ہو، وہ اس سے بے بہرہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کتاب کے ذریعے امجد حیات ملک کی بے چینی سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے دل میں جو درد ہے، سب اس سے آشنا ہو جائیں، بلکہ اسے اپنا لیں، لیکن ۲۲۵ صفحات کی یہ کتاب! ہمارا نوجوان تو ''خلاصے'' چاہتا ہے۔ سلمان رشدی کی واہیات سے جو منظر بنا، اس نے مصنف کو تحریک دی اور انھوں نے ورلڈ آرڈر کے حوالے سے پوری تاریخ کھنگال ڈالی۔

انھوں نے غیر معمولی محنت سے تاریخی واقعات کے پس پشت کام کرنے والے عناصر تک پہنچنے کی کوشش کی، اور یوں قاری کے لیے بیش قیمت معلومات نکال کر لائے ہیں۔ بعض اوقات ان کی تفصیلات میں کھو کر قاری کا رابطہ اصل بات سے کٹ بھی جاتا ہے۔ اندلس میں مسلمانوں کا خاتمہ، امریکہ میں ریڈ انڈین کا خاتمہ، افریقہ کے سیاہ فاموں پر مظالم، زرد فاموں (فلپائن، کوریا، جاپان) پر تسلط، یہ سب تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اور آخری بات صیہونی سازش کی پیش کی ہے۔ تبصرہ نگار کو دنیا کے ہر کام میں سازش اور وہ بھی صیہونی سازش تلاش کرنے کے نقطہ نظر سے اختلاف ہے۔ صیہونی سازش ہو یا نہ ہو، مگر حالات امت مسلمہ کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ وہ اپنے حقیقی منصب یعنی عالمی قیادت تک پہنچے، اور جو عالمی نظام خالق کائنات نے اپنے رسول آخرؐ کے ذریعہ پہنچایا ہے، اس کی

برکات سے انسانیت کو شاد کام کرے ۔کتاب سے تاریخ کے مطالعے کی اہمیت واضح ہوتی ہے ۔روایتی نصابات کے بجائے یا ان کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر طلبہ و طالبات کے لیے تاریخ کے مختلف ادوار پر مشتمل نصاب اس انداز سے مدون کیے جائیں کہ ان سے مسلم نوجوان کو اپنی شناخت ملے ' حالات سے آگہی ہو ' حقیقی پس منظر کا ادراک ہو ' اور جذبہ عمل بیدار رہو ۔ (مسلم سجاد)

Trying to Respond ' ڈاکٹر رابرٹ اے بٹلر' مرتب: محمد اکرام چغتائی ۔ ناشر: پاکستان جیسوسٹ سوسائٹی ' لاہور ۔ صفحات ۲۶۴ ۔قیمت ۲۰۰ روپے ۔

سوئٹزر لینڈ کے رہنے والے ڈاکٹر رابرٹ بٹلر نے علوم اسلامیہ میں ڈاکٹریٹ حاصل کی ۔ ۱۹۶۱ میں کیتھولک مشن پر پاکستان آئے ۔ ۱۳ برس تک اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے شعبہ اطالوی زبان کے سربراہ رہے ۔لاہور میں مشنری سرگرمیوں کے لیے ان کا قیام ۲۵ برس تک رہا۔ وہ فرانسیسی ' جرمن ' انگریزی اور عربی زبانوں سے آگاہ تھے ۔ ۱۹۹۶میں انتقال ہوا۔

زیر نظر کتاب ان کے دوست محمد اکرام چغتائی نے مرتب کی ہے ۔ سترہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب ' آنجہانی کے ذوق تحقیق ' ترجمے کی صلاحیت اور مشنری نقطہ نظر سے معاملات کو دیکھنے کے اسلوب کی تصویر ہے ۔کتاب کے چند ابواب کا مختصر تعارف کرائیں تو یہ شکل بنتی ہے: (۱) منصور حلاج کی کتاب الطواسین کا فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ۔ مستشرقین کے لیے تصوف جیسا اختلافی موضوع من پسند ہے 'کہ اس کے ذریعے وہ ایمان اور عمل کو مشق ستم بناتے اور اختلاف کی خلیج بڑھاتے ہیں ۔ (۲) جلال الدین رومی کے افکار کا ترجمہ ۔اس میں بھی تصوفانہ عقائد کو چنا گیا ہے ۔ (۳) اقبال کے افکار میں شیطان کے کردار کو موضوع بنا کر تصوف کی راہ تلاش کی گئی ہے ۔ (۴) تصوف کی روحانی منازل اور مدارج کے حدود اربعہ کا بیان ہے ۔ (۵) الہامی نام اور آج کا انسان ' ایک کلامی بحث ہے ۔ (۶) غلام احمد پرویز کی "قرآنی انقلابی فکر" کو بڑی محبت سے زیر بحث لایا گیا ہے ۔ پرویز کی اس ادا پر مصنف فدا ہو گئے ہیں کہ وہ سنت کی نفی کرتے ہیں ۔ (۷) چند کتب پر طویل تبصرے ہیں ۔ (۸) "مغربی پاکستان میں لادینی رجحان" مضمون میں پاکستان کو سیکولرائز کرنے کی خواہش پیش کی گئی ہے ۔ مختلف اکابرین کے بیانات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنی بات کو پھیلایا گیا ہے ۔ (۹) مختصر نوٹ میں پاکستانی مسلمانوں کے بارے میں مشاہدہ ہے ۔ (۱۰) "پاکستان میں مسلم مسیحی مکالمہ" میں مصنف کا خیال ہے کہ مغرب میں شائع شدہ تنقیدی کتب سے یہاں کے مسلمان خوفزدہ رہتے ہیں ' جس کے باعث غصے کا اظہار کرتے ہیں ۔ باہر سے آنے والے عیسائی مشنریوں کے بارے میں بھی تحفظات پائے جاتے ہیں ' لیکن ہم وطن عیسائیوں کی سماجی کسمپرسی کے باوجود ان کے حب وطن

کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ (۱۱) ""پاکستان میں احیاے اسلام اور کلیسا"" میں ""قرار داد مقاصد"" اور اس کی روشنی میں اسلامی پیش رفت کو اقلیتوں کے بارے میں نقصان دہ قرار دیا ہے۔ یہ مضمون خاصا یک رخا، منفی اور حقائق کے منافی ہے۔ (۱۲) ""مسلمانوں سے مذہبی مکالمہ کیوں مشکل ہے"" اس ضمن میں عیسائیوں کے ہاں رسالت محمدؐ کو نہ تسلیم کرنا، اور مسلمانوں کے ہاں مقامی عیسائیوں کو مذہبی مکالمے کے لیے فرو تر سمجھتے ہوئے اجتناب برتنا بڑے اسباب ہیں۔ (۱۳) مشنری کاوشوں میں تدبر اور حکمت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

یہ کتاب مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کے تصورات، طریق کار اور تعصبات کو سمجھنے کے لیے نادر نمونہ ہے۔ اس کتاب کے کئی ابواب بالخصوص ۸، ۱۰، ۱۱ مسلم ماہرین کے مطالعہ و تجزیہ کے متقاضی ہیں۔ یہ مسلمانوں اور پاکستان کے بارے میں منفی پروپیگنڈے کو آگے بڑھاتے اور بے جا غلط فہمیوں کو پھیلاتے ہیں۔ ان کی مدلل تردید اشد ضروری ہے۔ افسوس کہ مسلمان علما میں عیسائیت کے بارے میں مطالعے و تجزیہ کی روایت چند مناظراتی جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ یورپی زبانوں سے لاتعلقی نے بھی اس خرابی کو بڑھایا ہے۔ (محمد ایوب منیر)

وحدت ملی / فکر امروز، صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی، ناشر: اتحاد فاؤنڈیشن، ۴۹ کریم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: اول الذکر ۱۵۰ اور ثانی الذکر ۲۱۱۔ قیمت بالترتیب: ۷۵ روپے اور ۱۰۰ روپے۔

اول الذکر کتاب کا موضوع اتحاد امت اور عالمی اسلامی وفاق کا قیام ہے، جبکہ ثانی الذکر میں امریکی عالمی نظام، اسلامی عالمی نظام، جمہوریت اور اجتہاد وغیرہ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ موقف یہ ہے کہ اگر امت مسلمہ فرقہ واریت اور مادی تعصبات سے بالاتر ہو کر اخوت اسلامی کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق کا راستہ اختیار کرے تو بقا کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ ملت اسلامیہ کم از کم اپنے ""آج"" کی فکر کر سکے تو آنے والے ""کل"" کو بھی سنوار سکے گی۔ لہٰذا اتمام داخلی و خارجی خطرات کا مقابلہ کرنے کی راہیں تلاش کرنی چاہییں۔ اس سلسلے میں مصنف نے ان خطرات کی تفصیل بیان کی ہے اور ان اقدامات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان کے نزدیک عالمی امریکی نظام کا توڑ کرنے کے لیے دین اسلام کی انقلابی قوت کو بروئے کار لانے، سیاست کو دین کے تابع کرنے، معاشرت اور معیشت کو احسان و مروت کی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب گیلانی کا انداز بیان مدلل اور موثر ہے۔ وہ شاعری نہیں کرتے، نثر میں ساحری کرتے ہیں۔ ان کی باتیں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔

(ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

مدیر کے نام

ایک بندہ خدا ' کراچی

ترجمان القرآن (فروری ۹۵) کے صفحہ ۱۲ پر بندۂ خدا کے اشتہار کا عنوان تھا "کیا آپ اپنی آمدنی دوگنا کرنا چاہتے ہیں؟" یعنی ۱۰۰ فی صد اضافہ۔ اور اس کا آزمودہ نسخہ یہ بتایا گیا تھا کہ "آمدنی کا ۱۰ فی صد اللہ کی راہ میں بالالتزام انفاق کرنا شروع کر دیجیے"۔ یہ بات کچھ ایسی دل کو لگی کہ بس عمل شروع کر دیا۔ انفاق کرتے ہی دل میں وسوسے شروع ہو گئے۔ یہ تم نے کیا کیا' اچھی خاصی بڑی رقم نکال دی' ان اور ان اخراجات کے لیے رقم کہاں سے لاؤ گے' پہلے ہی مہنگائی ہے۔ مگر رحمان نے سہارا دیا۔ یہ انفاق بالالتزام کرتا رہا۔ ابھی چھ ماہ نہ گزرے تھے کہ آمدن میں ۱۰۰ فی صد نہیں بلکہ ۲۰۰ فی صد اضافہ ہوا۔ ایک سال بعد مزید اضافہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہے؟ یہ تو تھا مالی اضافہ' مگر ۱۰ فی صد انفاق کرنے کے بعد جو سکون قلب حاصل ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ وہ وساوس جو شیطان نے پیدا کیے تھے' رفوچکر ہو گئے۔ انفاق کرنے کے بعد جو رقم بچ رہتی تھی' اس میں سے نہ صرف تمام اخراجات بحسن و خوبی ہوتے رہے بلکہ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ خرچ کرنے کے بعد اتنی زیادہ رقم بچ رہتی کہ جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح برکت ڈالتا ہے اور کن کن راستوں سے رقم کو بڑھاتا ہے۔ اور یہ سب تو دنیا میں ہے۔ آخرت میں یقیناً اس سے کہیں زیادہ بدلہ ملے گا' مگر یہ بھی اللہ کی رحمت ہی پر منحصر ہے۔

عبدالحئی ابڑو ' اسلام آباد

مضامین بہت خوب ہوتے ہیں' الحمدللہ ہر شمارہ جدت و تنوع کا حامل ہوتا ہے' اس لیے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ مدیر محترم کی محنت' مطالعہ اور وسعت معلومات قابل رشک ہے۔ چند باتیں قابل توجہ ہیں۔ ۱۔ جن آیات کا آغاز "و" سے ہوتا ہے وہاں "و" حذف ہوتا ہے (ص ۲۲' ۲۳' ۲۷)۔ یہ آیت کا لازمی حصہ ہوتا ہے اور کسی صورت میں چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ۲۔ نصیحت کے اسلامی آداب' دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اکبر سباعی نے تشہیر کا لفظ استعمال کیا ہے' مترجم نے اسے جوں کا توں رکھا ہے۔ عربی اور اردو میں اس کا استعمال مختلف ہے۔ عربی میں اس کا مطلب ہے: کسی کی کردار کشی کرنا' بدنام کرنا' بری بات پھیلانا۔ نیز مترجم نے امام شافعی کے قول (ص ۳۵) کے آخر میں فھو عدل کا ترجمہ "وہی عادل ہے" کیا ہے جو صحیح محسوس نہیں ہوتا۔ عربی میں عدل اور عادل الگ الگ مفہوم کے لیے بولے جاتے ہیں۔ عدل کا لفظ نیک و صالح ہونے' اور فاسق و فاجر نہ ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ۳۔ حماس پر مضمون اچھا معلوماتی ہے۔ عربی نام حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ ہے نہ کہ الحرکۃ..... ۴ ص ۵۷ پر رضین عنہ میں ض کے نیچے زیر آنا

چاہیے۔ یہ چند متفرق چیزیں اس لیے لکھ دی ہیں کہ ترجمان کو ہر لحاظ سے ہر خامی سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں ورنہ دیگر رسائل میں اغلاط دیکھتے ہیں اور توجہ دلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

شہزاد چشتی' کراچی

اشارات (جولائی ۹۶) مدیر نے محبت رسولؐ میں ڈوب کر تحریر کیے ہیں۔ صاحب اشارات کی اس رائے کی روشنی میں کہ غلبہ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو ترجیحات اور حکمت عملی پر نظرثانی کرنا چاہیے' ایک تجویز یہ ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر سیرت محمدیؐ کے لیے کوئی مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو اس عنوان پر دنیا کی ساری زبانوں میں مختصر موثر مضامین کی اشاعت کرے اور ساری دنیا میں قرآن کے ساتھ صاحب قرآن کی زندگی کی روشنی بھی پھیلائے۔

شوکت جمیل' اسلام آباد

اسلامی قانون کا عمومی تعارف (جون' جولائی ۹۶) بہت ہی معلومات افزا مضمون ہے۔ جدید مغربی قانون کی تعلیم میں اسلامی قوانین کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ اگر ان اصطلاحات کو مروجہ قانون سے ساتھ مطابقت دے کر پیش کیا جائے تو ہمارے وکلا' جج اور قانون کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہو گا۔

سید محمد شفیق' لاہور

اسلامی قانون (جون ۹۶) میں کہا گیا ہے کہ مسلم دانش وروں کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی قوانین کی برتری اور ابدیت ثابت کریں تاکہ مغرب کو ان سے جو اندیشے ہیں' وہ دور ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ مغرب اسلامی قوانین کو اچھی طرح جانتا ہے۔ غلط فہمی کا مسئلہ نہیں ہے' دشمنی اور حسد ہے۔ ہمیں سمجھانے کے بجائے الزامی جواب کی حکمت عملی اختیار کرنا چاہیے۔

ضیاء الدین رحمانی' منگورہ

سب ہی مضامین اعلیٰ ہوتے ہیں لیکن کتاب نما (اپریل ۹۶) میں 'جناب' غلام احمد پرویز کی لغات القرآن کو بھی اہل علم و فضل کی ضرورت بتایا گیا ہے۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ اپنے قارئین کو کیا پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں' اس نے تو صریح معنوی تحریف کی ہے۔

ڈاکٹر اسحاق بھٹی' برزبین' آسٹریلیا

یوں تو ترجمان کے سب ہی اشارات خوب سے خوب تر ہوتے ہیں لیکن لبنان' شہنشاہ اور قزاق کی کہانی (جون ۹۶) ایک عام فہم تحقیقی مقالہ تھا۔ بہت پسند آیا۔

ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی' علی گڑھ

آپ نے ترجمان القرآن کو صرف نیا آہنگ و رنگ نہیں دیا بلکہ اس کو علمی گہرائی و گیرائی بھی عطا کی ہے۔ مضامین میں تنوع پیدا کیا ہے اور خوبصورتی کے دوسرے زاویے بھی۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ موضوعات

کے حوالے سے کچھ عرض کر دوں - بلاشبہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل بالخصوص پاکستانی سماج کی تعمیر و اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سیاسی مضامین بھی ہوں' اور تنوع پیدا کرنے کے لیے کچھ دوسرے مقالات بھی - مگر وہ مفکر اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمان القرآن ہے' اسے قرآن مجید کا اور اس کی تعلیمات کا ترجمان ہونا چاہیے - زیادہ کیا عرض کروں -

محمد ذکی کرمانی' علی گڑھ

ترجمان القرآن کے ذریعے ہر مہینہ آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے - فہم حدیث اور اداریہ بڑے شوق اور پابندی سے پڑھتا ہوں - یہ واقعہ ہے کہ ترجمان القرآن کے پڑھنے سے اور خاص طور پر فہم حدیث اور اداریے سے ایمان کی پایدگی میں اضافہ ہوتا ہے اور امت مسلمہ کے اصل منصب دعوت و اقامت دین کے فریضہ کی تذکیر بھی ہوتی ہے - اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر کے لیے اجر عظیم عطا فرمائے اور امت کو بھولا ہوا سبق یاد دلائے -

مبشر اکرم ، راجا انصار احمد' قرطبہ' سپین

پرچہ پابندی سے مل رہا ہے - سارے مضامین ہی بہت اچھے ہوتے ہیں' اشارات تو ترجمان کی جان ہوتے ہیں - سوال و جواب کا سلسلہ' اور عالمی حالات و واقعات پر مضامین بھی نہایت مفید ہوتے ہیں -

عبد الجبار خالد' ہارون آباد

حضور نبی کریمؐ کی محبت و اطاعت کی طرف توجہ دلانے کے لیے (اشارات' جولائی ۹۶) لفظ "آستانہ" (ص ۱۲' ۱۴) کے استعمال کی ضرورت تو نہ تھی - یہ لفظ تو بزرگوں کے مزاروں اور ان کی خانقاہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے - یہ لوگ وہاں اپنی مرادیں پوری کرنے کے لیے جاتے ہیں -

غازی الدین احمد' کراچی

ترجمان مختلف اہل علم کی تحریرات کا گلدستہ ہوتا ہے - ہر ایک اپنے انداز سے لکھتا ہے - کسی خیال کے لیے جو لفظ موتی کی طرح جڑا ہوتا ہے "آسان کرنے کے لیے' اسے بدل دینے سے اثر آفرینی جاتی رہے گی - آسان الفاظ کے چکر میں ترجمان کا معیار سیکنڈری سکول کے نصاب دینیات کا نہ ہو جائے !

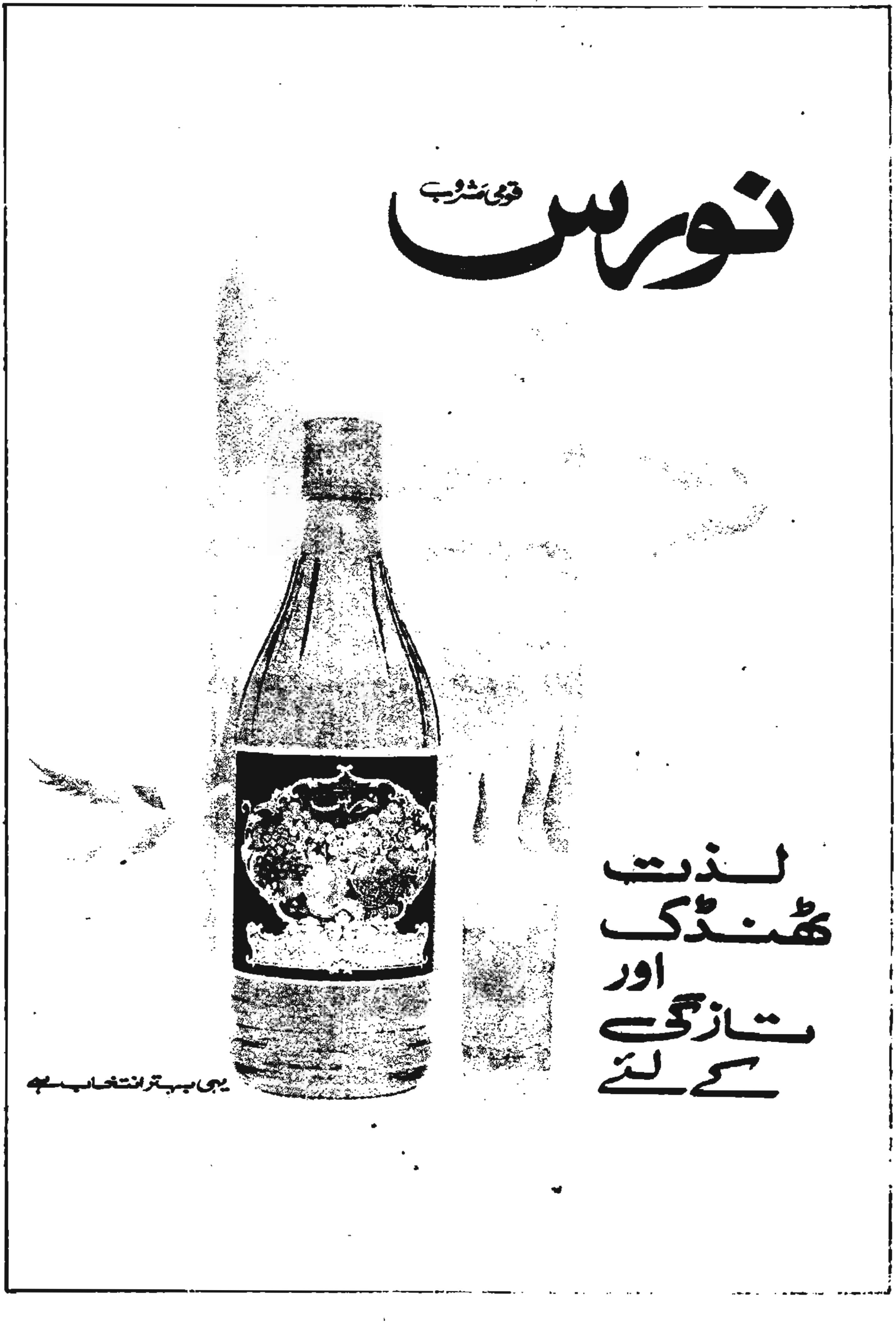
عمر عبد العزیز' نیویارک

یہاں ۵' ۶' ۷ جولائی کو اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کی کانفرنس میں ترجمان القرآن کا اسٹال لگایا - بھیجی ہوئی تمام چیزیں مل گئی تھیں - ۱۵۰ سے زائد نئے خریدار بن گئے - منشورات کے کتابچے بھی بہت مقبول ہوئے - کوئی ۵۰ سے کم نہیں لینا چاہتا تھا - چند لمحات کلام نبویؐ کے ساتھ بہت پسند کیا گیا - اس کا اگلا آرڈر ان شاء اللہ ہزاروں میں ہو گا - آیندہ ماہ ISNA کی کانفرنس ہے - اس میں جانے اور اسٹال لگانے کا ارادہ ہے - اس کا آرڈر بھی دوں گا - دیگر تحریکی رسالوں کی بھی مانگ ہے -



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC
Cashmira
BLANKETS
ABC
KNITTING
YARNS
Plush Mink
BED
COVERS
AND
BLANKETS
SANAULLA
CARPET
YARNS
SANAULLA
WEAVING
YARNS
516035 Fax 92-21
21699 SANA PK

adcom 89-92


قومی مشروب
نورس
لذت
ٹھنڈک
اور
تازگی
کے لئے
یہی بہتر انتخاب ہے

بیرونِ ممالک ترجمان القرآن حاصل کرنے کے لیے رابطہ پتے:

MAKTABA KULLIAH ALHINSAH
JAMIATUL MALAE ABDUL AZIZ
P.O.BOX 9027 JIDDAH
SAUDI ARABIA

SAIFULLAH SANAI
P.O.BOX 9178
DAMMAM 31413
SAUDI ARABIA

ADAAB BOOK SHOP
P.O.BOX 287
MANAMA
BAHRAIN

ANAYAT HUSSAIN GHAURI
P.O.BOX 382
ABU DHABI
UAE

MANZOOR ILAHI
P.O,BOX 621
DUBAI
UAE.

MR.MUHAMMAD SALAHUDDIN
DARUL SAUDIA JAUHARIA
AL BAGHDADIA BUILDING
P.O.BOX 2043
JEDDAH-21451

UMER ABDUL AZIZ
755-EAST 9 STREET#.B.6.
BROOKLYN
NEW YORK-11230(U.S.A)
✆ (781)421-5428

ISLAMIC BOOK CENTER
120,DRUMMOND ST.
LONDON N.W.1 2HL
UK.

UK ISLAMIC MISSION
121,OAKLAND ROAD HANWELL
LONDON W7 2DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
401-403,ALUM ROCK ROAD
BIRMINGHAM B-8 3DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
19- CARRINGTON STREET
GLASGOW G4 9AJ
UK.

UK ISLAMIC MISSION
1 TYDFIL PALACE
ROTH PARK CARDIFF
SOUTH WALES UK.

SYED SHAUKAT ALI
DEPT. OF COMMUNICATIONS
INTL.ISL.UNI. P.O.BOX 70
JALANJAN 46700-PJ SELANGER
MALAYSIA

RAFAY SAMAN
423,BARA MUGH BAZAR
ELEPHANT ROAD DHAKA
BANGLA DESH

دیگر ملکوں میں بھی خواہشمند رابطہ کریں:

مینیجر ترجمان القرآن، ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 54600 فون 042-7587916

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

REGD. NO. L 5340

PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE